خوش دامنی
محی الدین نواب

انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی کی صورت میں آخری وارننگ موصول ہوئی تھی۔ اس آخری نوٹس میں لکھا تھا اگر پندرہ دن کے اندر مقررہ تاریخ تک پندرہ لاکھ روپے ٹیکس کے ضمن میں ادا نہ کیے گئے تو مجھے قانوناً حراست میں لے لیا جائے گا یا میری جائداد کی قرقی عمل میں آئے گی۔

دونوں ہی باتیں میرے لیے توہین آمیز تھیں۔ میں شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں' اس لیے سوسائٹی میں عزت ہے۔ ایک کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت بھی حاصل ہے' حالانکہ میں کامیاب بزنس مین نہیں ہوں۔ دس پیسے کا آدمی ہوں مگر اپنی حکمتِ عملی سے خود کو دس لاکھ کا ثابت کرتا رہتا ہوں۔

ہم جیسے خاندانی' شریف زادوں کے لیے یہ بڑی مشکل ہے کہ ہمارے باپ دادا ورثے میں صرف شرافت چھوڑ جاتے ہیں' دولت نہیں چھوڑتے۔ اونچی سوسائٹی میں لوگ دولت کے بغیر شریف آدمی کو بے چارہ کہہ کر گزر جاتے ہیں اور میں اس دنیا میں بے چارہ بن کر رہنا نہیں چاہتا' اس لیے جھوٹ بولتا ہوں' دھوکا دیتا ہوں' الٹے سیدھے کاروبار کرتا ہوں اور اپنی ساکھ قائم رکھتا ہوں۔

میرے والد مرحوم بالکل ہی گئے گزرے نہیں تھے۔ وہ اُن ہاتھیوں میں سے تھے جو مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کے ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے میرے لیے چھ ہزار گز کے پلاٹ پر ایک خوب صورت کوٹھی اور ایک قیمتی کار چھوڑی تھی۔ ایک ایسا کاروبار بھی تھا جو میری آمدنی کا معقول ذریعہ تھا۔ بنک میں ستر ہزار روپے تھے۔ میں جس امیر ترین طبقے میں سانس لے رہا ہوں وہاں ستر ہزار روپے صرف ستر روپے کے برابر ہوتے ہیں۔ اس طبقے میں ایسے کروڑپتی اور ارب پتی ہیں جو پہلے اللہ سے ڈرتے ہیں' پھر قانون سے ڈرتے ہیں اور پھر اپنی شرافت سے ڈرتے ہیں' اس لیے نہایت ایمان داری سے کاروبار کرتے ہیں

لیکن ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ بڑی بے باکی سے رشوتیں دیتے ہیں۔ چور بازاری کرتے ہیں اور اسمگلنگ کے ذریعے کروڑ پتی اور ارب پتی بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ گرفت میں نہیں آتے کیونکہ ان کا بنک بیلنس برائے نام ہوتا ہے۔ جائداد اُن کے نام پر نہیں ہوتی۔ انکم ٹیکس والے اپنی گرفت اُن پر مضبوط نہیں رکھ سکتے۔ کچھ اس لیے بھی نہیں رکھ سکتے کہ رشوتوں کا بازار گرم رہتا ہے۔

میں کبھی چور بازاری یا اسمگلنگ کی طرف مائل نہ ہوسکا‘ ہمیشہ ڈر لگتا رہا۔ اس لیے شریف یا بزدل لوگوں کی طرح چھوٹے سے کاروبار میں اُلٹ پھیر کرتا رہا۔ یوں آمدنی کبھی بڑھ جاتی تھی اور کبھی برائے نام رہتی تھی۔ میں نے تقریباً دس برس تک انکم ٹیکس ادا نہیں کیا۔ کچھ نہ کچھ رشوتیں دے کر کام چلاتا رہا اور اپنا کیس منوں فائلوں کے نیچے گُم کرنے میں کامیاب ہوتا رہا لیکن صرف بکرے کی ماں ہی نہیں‘ بکرے کا باپ بھی ہمیشہ اپنی خیر نہیں منا سکتا۔ کبھی نہ کبھی قانون کے چھُرے تلے آتا ہے اور میں بھی آگیا۔

جائداد کی قُرقی کا مطلب یہ ہوا کہ میری کوٹھی نیلام ہوسکتی تھی اور یہ میرے لیے بڑی توہین کی بات تھی۔ میں امیر ترین طبقے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اگر اپنی کوٹھی کو فروخت کر دیتا تو تقریباً پچیس لاکھ روپے مل سکتے تھے لیکن پھر رہائش کا مسئلہ درپیش ہوتا۔ میں پندرہ لاکھ روپے ٹیکس کے ادا کرنے کے بعد دس لاکھ روپے میں ایسی شاندار کوٹھی نہیں خرید سکتا تھا۔

اگر کوٹھی کو نیلام ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا تو قانون مجھے حراست میں لے لیتا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑجاتی۔ یہ اور زیادہ توہین کی بات ہوتی۔ میری سب سے بڑی کوالٹی یہ تھی کہ میں کنوارا تھا۔ کئی ساس اور سُسر قسم کے لوگوں کی نظریں مجھے تاڑتی رہتی تھیں۔ ایک ہاں‘ کہنے کی دیر تھی پھر پندرہ لاکھ کیا پچاس لاکھ بھی مل سکتے تھے۔

میری آمدنی کا ایک ذریعہ محفوظ تھا۔ لہٰذا میں دوسرے پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ کیا میں کسی طرح کی چور بازاری کر سکتا ہوں؟ کوئی مال اِدھر سے اُدھر اسمگل کر سکتا ہوں؟ آج کل منشیات کا بڑا زور ہے۔ کیا میں اس غیر قانونی دھندے میں کوئی کارنامہ انجام دے کر کروڑوں تک پہنچ سکتا ہوں؟



یہ تمام سوالات میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی کام کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ آدمی اپنی دنیا میں جو سب سے پہلی چیز کماتا ہے‘ وہ عزت ہے۔ ہم جیسے شریف لوگ بھی عزت سے کمانا چاہتے ہیں۔ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو عزت سے بولتے ہیں۔ میرے پاس دولت کمانے کے بہتیرے نسخے تھے لیکن میں ان میں سے کسی ایک پر بھی عمل نہیں کرسکتا تھا۔ تھک ہار کر یہی سوچا کہ عمر گزر رہی ہے لہٰذا شادی کر لوں۔

جب میں نے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو گویا وہ ایک اعلان تھا۔ اس اعلان سے امیر ترین طبقے میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اس طبقے کا ہر دولت مند یہ سوچتا تھا کہ دُنیا کی ہر وہ چیز جو پہلی بار متعارف ہوئی ہو‘ وہ ان کے گھر کی زینت کیسے بن سکتی ہے۔ مثلاً جب پہلی بار کلر ٹی وی اپنے ملک میں آیا تو یہاں کے دولت مند مہنگے سے مہنگا ٹی وی اپنے گھروں میں رکھتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ اب کلر ٹی وی جھگیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کے بعد وی‘ سی‘ آر متعارف ہوا تو اُس کی دوڑ شروع ہوگئی۔ سچ تو یہی ہے کہ پہلی بار متعارف ہونے والی ہر چیز سب سے پہلے دولت مند گھرانوں میں پہنچتی ہے‘ اس لیے بہت زیادہ قیمتی ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی چیز جھگیوں سے شروع ہو کر عالی شان کوٹھیوں تک پہنچے تو شروع ہی سے اُس کی قیمت میں معقولیت ہوگی۔ مثلاً اگر میں اپنے کنوارپنے کا راگ جھگیوں سے اَلاپنا شروع کرتا‘ تو میری وہ قیمت نہیں ہوتی جو اُونچی کوٹھیوں سے شروع ہورہی تھی۔

ایک بروکر نے کہا۔ ”مسٹر بشیر خان اپنی بڑی بیٹی کی شادی میں دس لاکھ کا جہیز دے سکتے ہیں۔ اگر چاہو تو جہیز کے بجائے دس لاکھ کیش لے سکتے ہو۔ یوں تو اُن کا بڑا کاروبار ہے‘ بڑی دولت ہے‘ لیکن اُن کی سات بیٹیاں ہیں۔ اس لیے دس لاکھ سے زیادہ نہیں دے سکیں گے۔“

ایک مشاطہ نے کہا۔ ”پندرہ لاکھ مل سکتے ہیں۔ ہاں کہہ دو‘ دُلہن اپنے ساتھ رقم لے آئے گی۔ اس سے زیادہ نہیں مل سکتے۔ لڑکی کی ماں سوتیلی ہے۔ حالاں کہ کروڑوں کی مالک ہے لیکن سوتیلی بیٹی کو پندرہ لاکھ سے زیادہ نہیں دے گی۔“

میں نے حقارت سے اونہہ کہہ دیا۔ جیسے اتنی رقم میرے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ حالاں کہ اتنی ہی رقم کے لیے میری ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ سکتی تھی یا میری جائداد قرق ہوسکتی تھی۔ میرے سامنے دو ہی باتیں تھیں۔ یاتو میں لوہے کی ہتھکڑی پہن لوں یا شادی کے نام پر عمر بھر کے لیے پھولوں کی ہتھکڑی میں اپنے ہاتھوں کو جکڑ دوں۔ چونکہ پھولوں کی ہتھکڑیاں خوب صورت لگ رہی تھیں۔ کھرے دام دینے والی تھیں۔ اس لیے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

بیگم شائستہ مرزا' انجمن خواتین کی چیئرپرسن تھیں۔ بڑی ہی بااخلاق' سرگرم سماجی کارکن تھیں۔ پورے شہر میں بلکہ پورے ملک میں تحفظ حقوقِ نسواں کی زبردست علمبردار کہلاتی تھیں۔ اُن کی انجمن کا نام ویلا تھا۔ اس کے انگریزی ہجے وی' آئی' ایل' اے تھے' جس کا واضح مفہوم تھا۔ "ویری امپورٹنٹ لیڈیز ایسوسی ایشن۔"

بعد میں انجمن خواتین کے متعلق جو ذاتی تجربات ہوئے اس کے پیشِ نظر میں نے اس انجمن کا نام وِیلا کی بجائے گول مال رکھ دیا۔ گول مال کے انگریزی ہجے جی' او' ایل' ایم' اے' ایل ہیں' جس کا واضح مفہوم ہوتا ہے "جنرل آرگنائزیشن آف لیگل مدر اینڈ لاء۔" یعنی قانونی ساسوں کی تنظیم عام۔ سانسوں' سانس کی جمع ہے اور ساسوں' ساس کی جمع۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ سانس سلامت رہے تو زندگی سلامت رہتی ہے اور ساس سلامت رہے تو زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سانس آتی ہے تو جاتی بھی ہے۔ ساس آتی ہے تو کبھی نہیں جاتی۔ خواتین کی انجمن گول مال میں تمام عمررسیدہ خواتین تھیں اور وہ تمام خواتین کسی نہ کسی بہو یا کسی نہ کسی داماد کی ساس تھیں اور بیگم شائستہ مرزا ان ساسوں کی چیئرپرسن تھیں گویا کہ عظیم ساس تھیں۔

بیگم صاحبہ نے بڑی ممتا سے کہا۔ "بیٹے! میں نے سُنا ہے تم شادی کا ارادہ رکھتے ہو۔ خیریت تو ہے۔ ایسا کیا مسئلہ پیش آگیا۔ تم ویسے تو شادی کرنے والوں میں سے نہیں ہو۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے بتاؤ؟"

"بیگم صاحبہ! آپ تو ہماری بزرگ ہیں' آپ سے کیا چھپانا۔ ایک مسئلہ درپیش ہے لیکن کلب میں کیا بیان کروں۔ یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ سننے والے دس باتیں بنائیں



گے۔"

"کوئی بات نہیں' کل لنچ میرے ساتھ کرو۔ وہاں ہم تمھارے مسئلے پر ڈسکس کریں گے۔ ویسے میں سمجھادوں' شادی خوب سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں ایک ایک ساس' ایک ایک بہو' اور ایک ایک داماد کی رگ رگ سے واقف ہوں جو مشورہ دوں گی وہ کوئی دوسری نہیں دے سکے گی۔"

میں نے تسلیم کیا اور دوسرے دن اُن کے ہاں لنچ کے وقت پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ اُن کی ایک بیٹی ہے جو پتا نہیں کتنے برسوں سے بن بیاہی بیٹھی ہے۔ اُنھوں نے میری لیے بڑے ہی پُرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں' تمھارے انتظار میں بھوکی ہوں' تم نے آنے میں دیر کردی۔ آدمی کو پنکچوئل ہونا چاہیے۔"

انھوں نے بڑی اپنائیت سے ڈانٹنے کے انداز میں یوں کہا جیسے ماں اپنے بیٹے کو پیار بھری ناراضگی سے سمجھا رہی ہو۔ یہ بڑا پُرانا حربہ ہے۔ عورت ساس بننے سے پہلے ماں کا رول ضرور ادا کرتی ہے۔

کھانے کی میز کے اطراف بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "کیا گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

"ایک میری بیٹی ہے جو نہایت شرمیلی ہے' میں نے اُسے اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ پردے کی سخت پابند ہے' اس لیے یہاں نہیں آسکتی۔"

"میرا مطلب ہے' آپ کے شوہر؟"

"وہ باہر گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے' تم کھانا شروع کرو۔"

میں نے کھانا شروع کیا' اُنھوں نے بولنا شروع کیا۔ گفتگو کا موضوع اُن کی بیٹی واجدہ تھی۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ واجدہ پیدا نہ ہوتی تو دنیا میں شاہکار پیدا نہ ہوتا۔ ان کے ہاں اُس کے بعد پھر کوئی اور بیٹی پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ایک کے بعد دوسرے شاہکار کی تخلیق ممکن نہیں ہوتی۔

وہ اپنی بیٹی کے گُن گاتی رہیں۔ اس دوران سوال بھی کرتی رہیں۔ "ہاں تو تمھارا

پرابلم کیا ہے؟"

"جی وہ انکم ٹیکس والوں نے آخری نوٹس دیا ہے۔ اگر میں پندرہ لاکھ روپے ادا نہ کرسکا تو............"

اُنھوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ فکر نہ کرو۔ میری بیٹی واجدہ اکاؤنٹنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ہمارے کاروبار کا کھاتہ وہی سنبھالتی ہے۔ آمدنی اور اخراجات کا حساب یوں برابر کرتی ہے کہ انکم ٹیکس والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔"

"لیکن بیگم صاحبہ! اب تو میں پھنس چکا ہوں۔ حساب بدلا نہیں جاسکتا۔ پچھلے دس برس کا تمام کچا چٹھا انکم ٹیکس آفیسر کی نظروں میں آگیا ہے اور وہ آفیسر بہت ہی سخت ہے' اصول کا پابند ہے۔ اُسے کوئی رشوت دینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ورنہ میں رشوت دے کر اپنے تمام کھاتے واپس لے کر اُن میں تبدیلی کرسکتا تھا۔"

"اچھا تو تم پندرہ لاکھ حاصل کرنے کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے ذرا ناگواری سے کہا۔ "بیگم صاحبہ! میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔ پندرہ لاکھ روپے کھڑے کھڑے انکم ٹیکس آفیسر کے منہ پر مار سکتا ہوں۔"

وہ فوراً ہی سنبھل کر بولیں۔ "تم تو ناراض ہوگئے۔ میں تمھیں اپنا بچہ سمجھتی ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ رقم تو تمھارے پاس یقیناً ہوگی۔ تم بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ کاروبار بھی ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے بلکہ دوڑ رہا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کاروباری آدمی وہی ہے جو اپنی جیب سے انکم ٹیکس ادا نہ کرے بلکہ دوسرے ذرائع سے ادائیگی ہو جائے تو اچھا ہے۔ تم بہت ذہین اور ہونہار لڑکے ہو۔ میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں اور مانتی ہوں کہ تم کسی دوسرے ذریعے سے یہ رقم ادا کردوگے۔"

میں اپنی تعریف پر مسکرانے لگا۔ اُنھوں نے کہا۔ "میں تمھیں بیس لاکھ روپے دے سکتی ہوں۔"

میری اُوپر کی سانس اُوپر ہی رہ جانے والی تھی مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "تم اچھی طرح گھوم پھر کر دوسرے خاندانوں میں دیکھ لو۔ لڑکیاں تو ایک سے ایک ہوں گی لیکن میری واجدہ کا کہیں جواب نہیں ملے گا۔ اگرچہ وہ پردے کی پابند



ہے۔ سامنے نہیں آئے گی لیکن میں چپکے سے اُس کی ایک جھلک دکھا سکتی ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لیے دی ہیں۔ آپ دکھا رہی ہیں تو میں ضرور دیکھ لوں گا لیکن بیس لاکھ کم ہیں۔"

"برخوردار! میں جانتی ہوں' تمھیں بیس کے بجائے پچیس لاکھ بھی مل سکتے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھو' دوسرے جتنی رقم دیں گے' اس سے دُگنی رقم مہر میں لکھوائیں گے اور تم پچیس لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ کے مقروض ہوجاؤ گے۔ بیوی کسی وقت بھی پچاس لاکھ کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ تمھارے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔ کبھی تم اُسے چھوڑنا چاہو تو پچاس لاکھ ادا کیے بغیر چھوڑ نہیں سکو گے۔ میں نے تو اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دی ہے کہ شوہر کے گھر سے مر کر ہی نکلے گی۔ ہم طلاق کو عورت کے لیے بہت بڑی گالی سمجھتے ہیں۔"

ان کی یہ بات بالکل دُرست تھی۔ جو لوگ مجھے دس لاکھ اور پندرہ لاکھ روپے دینے کو تیار تھے' وہ مہر کی رقم دُگنی لکھوانا چاہتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ مہر کی رقم کیا لکھوائیں گی؟"

"جتنا دوں گی' اتنی ہی رقم لکھواؤں گی۔ مجھے کوئی کاروبار نہیں کرنا ہے۔ عزت آبرو سے اپنی بیٹی بیاہنا ہے۔"

"پھر بھی ہم سب کاروباری لوگ ہیں۔ آپ نے کچھ تو اپنا مفاد دیکھا ہوگا۔"

"تم نے ابھی دنیا کتنی دیکھی ہے؟ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی لالچ کے بغیر دوسروں کے کام آتے ہیں اور اپنا کام نکالتے ہیں۔ میں تمھیں اپنے بیٹے کی طرح چاہتی ہوں۔ تم مجھے پسند آئے ہو' اس لیے اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرنا چاہتی ہوں۔ چونکہ میں تمھیں پریشان نہیں دیکھ سکتی' اس لیے بیس لاکھ بھی دے رہی ہوں کسی شرط کے بغیر۔ یہ رقم ناقابلِ واپسی ہے۔ شادی کی بات الگ ہے۔ مہر کی رقم تو لکھوانا ہی پڑتی ہے۔ تم جو رقم مہر میں دوگے' وہ بھی واجدہ کو ملے گی۔ مجھے تو نہیں ملے گی۔ میں تو سراسر گھاٹے میں رہوں گی اور تم پوچھ رہے ہو کہ میرا مفاد کیا ہے؟"

میں نے ندامت سے کہا۔ "میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی' آپ عظیم خاتون ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ ”بزرگ اُس وقت ہی عظیم ہوتے ہیں جب بچے اُن کی عظمت کو پہچانتے ہیں۔“

کھانا ختم ہوچکا تھا۔ ہم اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آنے لگے۔ وہاں پہنچتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ ایک صوفے پر نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی تھی۔ میں بیگم صاحبہ سے باتیں کرتا آرہا تھا' اس لیے وہ بدک گئی۔ فوراً آنچل سے اپنے چہرے کو چھپالیا۔ دوسری طرف منہ پھیر کر اٹھی اور باہر جانے لگی۔ بیگم شائستہ مرزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! ان سے پردہ نہ کرو۔ آجاؤ۔“

لیکن وہ رُکی نہیں' تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ میں نے اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور یقین کرلیا تھا کہ واقعی بیگم شائستہ مرزا کے ہاں ایک شاہکار موجود ہے۔ اس کے شرماتے ہوئے باہر جانے کا انداز بھی بہت دلکش لگا تھا۔ نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی میں اس کے تصور میں گُم تھا۔ بیگم شائستہ مرزا نے پوچھا۔ ”کیا ہوگیا' کہاں کھو گئے ہو؟“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا' پھر مسکرا کر کہا۔ ”اگر یہی واجدہ ہے تو مجھے منظور ہے۔“

شادی میں دیر نہیں کی جاسکتی تھی کیوں کہ انکم ٹیکس والوں نے پندرہ دن کے اندر ادائیگی کا نوٹس دیا تھا اور سات دن گزر چکے تھے۔ بیگم شائستہ مرزا نے کہا۔ ”میں کسی لالچ یا مفاد کی خاطر اپنی بیٹی کو تمھاری شریکِ حیات نہیں بنا رہی ہوں لہٰذا بیس لاکھ روپے شادی سے پہلے ادا نہیں کروں گی۔ تم میری بیٹی کو بیاہ کرلے جاؤ گے۔ دوسرے دن ولیمہ ہوگا۔ میں ولیمے کے دن پوری رقم ادا کردوں گی۔“

”آپ یقیناً اس معاملے میں دیانت دار ہیں۔ آپ کو کوئی لالچ نہیں ہے پھر بھی آپ کاروباری انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ شادی کے بعد رقم کی ادائیگی ہوجائے گی؟“

”میں تمہیں یقین دلانے کے لیے اسٹامپ پیپر پر یہ تحریر دے سکتی ہوں کہ ولیمے کے دن تمہیں بیس لاکھ روپے ادا کر دوں گی۔ عدم ادائیگی کی صورت میں تم میرے



خلاف کچھ بھی کر سکتے ہو۔ عام مردوں کی طرح جہیز نہ دینے یا رقم کا مطالبہ پورا نہ کرنے کی صورت میں میری بیٹی کو چھوڑ سکتے ہو' بولو منظور ہے؟“

ان کی بات معقول تھی۔ اگر میں تسلیم نہ کرتا تو نامعقول کہلاتا۔ غرض یہ کہ چوتھے دن شادی ہوگئی۔ میں واجدہ جیسی حسین دُلہن اپنے گھر لے آیا۔ حجلۂ عروسی میں سہاگ کی پھولوں بھری سیج پر اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو وہ روپ کی رانی سر جھکائے' آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔

اس لمحے وہ شرابِ دوآتشہ تھی۔ ایک اس کے حسن کی تھی' دوسری اس بیس لاکھ روپے کی' جو دوسرے دن مجھے ملنے والے تھے۔ میں نے کہا۔ ”مجھ سے نہ شرماؤ۔ میں تمہارا شریکِ حیات ہوں۔“

لیکن وہ شرما رہی تھی۔ میں اُس کی خوشامدیں کرنے لگا۔ میں نے اُسے منایا۔ بار بار منایا تو وہ مان گئی۔ پھر نظریں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میری طرف دیکھو۔“

اس نے فوراً نظریں جھکالیں۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ میری طرف کیوں نہیں دیکھتی؟ کیا دیکھنا نہیں چاہتی ہو مجھے؟“

اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔ جیسے سمجھا رہی ہو کہ میں اُسے غلط نہ سمجھوں۔ میں نے بڑی محبت سے کہا۔ ”اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میری طرف دیکھو۔“

اس نے پھر پلکیں اٹھائیں اور دیکھنے لگی مگر اس مرتبہ بھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ ایک دم میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ایک شعر کا مصرعہ یاد آیا۔

کیسے تیر انداز ہو' سیدھا تو کر لو تیر کو

میں اُسے تیر سیدھا کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ قدرتی طور پر ترچھی نظروں والی تھی یعنی بھینگی تھی۔ مجھے دیکھتی تو لگتا تھا دوسری طرف دیکھ رہی ہے اور دوسری طرف دیکھتی تو گویا مجھے دیکھتی تھی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دیکھ

رہی ہو؟"

اس نے سر جھکا کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ گویا تصدیق کر دی۔ میں نے کہا۔

"میں نے پہلی بار تمھاری ایک جھلک دیکھی تھی۔ کیا تم نے اس لیے منہ چھپایا تھا اور ڈرائنگ روم سے بھاگ گئی تھیں کہ میں تمھاری آنکھوں کو نہ دیکھ سکوں؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "دنیا میں کون ایسا ہے جو اپنے عیب نہیں چھپاتا۔"

"گویا تم نے اس طرح مجھے دھوکا دیا؟"

"دھوکا آپ کو کیسے دے سکتی تھی؟ کیونکہ آپ کے ساتھ تو زندگی بھر کا بندھن بندھنا تھا۔ اُس روز نہیں دیکھا آپ نے مگر آج کے دن تو دیکھنا ہی تھا اور آج آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اگر میں ناپسند ہوں' میرا یہ نقص ناقابلِ برداشت ہے تو ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آپ مجھے گھر سے نکال سکتے ہیں۔"

میں سوچنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک حُسن کا شاہکار تھی۔ لوگ حُسن کی خاطر ساری دُنیا کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ کیا میں اس کی ترچھی نظر کو نظر انداز نہیں کر سکتا؟ چنانچہ میں نے اس کا ایک عیب نظرانداز کر دیا۔

دوسری صبح میری خوش دامن صاحبہ تشریف لائیں۔ انھوں نے کہا۔ "اپنے انکم ٹیکس کے تمام رجسٹر اور ضروری کاغذات مجھے دے دو۔"

میں نے کہا۔ "یہ میرے کاروباری معاملات ہیں۔ آپ انکم ٹیکس کے افسران کو نہیں سمجھا سکیں گی۔ مجھے پندرہ لاکھ روپے دے دیں تاکہ میں نوٹس کے مطابق ادائیگی کردوں۔"

"نوٹس کے مطابق ادائیگی میں چار دن باقی ہیں۔ دو دن بعد ولیمہ ہے۔ میں اُس وقت تک تمھارے پندرہ لاکھ کا حساب برابر کردوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پندرہ لاکھ جو میں تمھیں دوں گی' وہ تم انکم ٹیکس والوں کو ہی تو دو گے۔ لہٰذا اپنے کاغذات اور ضروری رجسٹر وغیرہ مجھے دے دو۔ میں خود یہ رقم انھیں ادا کردوں گی۔"



میں ان سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر واجدہ کا سحر طاری تھا۔ میں نے ضروری کاغذات ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "وہ آفیسر بہت ہی ایمان دار ہے۔ میں اسے ہر طرح آزما چکا ہوں۔ کبھی رشوت پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ پندرہ لاکھ بچالیں گی اور ایک آدھ لاکھ میں معاملہ نمٹالیں گی تو غلطی پر ہیں۔ بہرحال میں تو انکم ٹیکس والوں کی گرفت سے نکلنا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف رسید چاہیے کہ ادائیگی ہو چکی ہے۔"

"تمھیں رسید سے کیا مطلب ہے' جو نوٹس آیا ہے اس پر عمل نہیں ہوگا۔ تمھیں ٹیکس ادا کرنے کے لیے کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ تم سمجھ سکتے ہو' ان معاملات میں کتنی دیر لگتی ہے۔ یہاں سے اوپر تک تمھارے کاغذ بدلنے ہوں گے' تب کہیں جاکر ایک رسید تیار ہو سکے گی۔ اس کے لیے صبر کرو۔"

میں ان کی صاحب زادی کے ساتھ صبر کرنے لگا' لیکن اب محبت کے پھولوں میں ایک کانٹا کھٹک رہا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ میری ساس صاحبہ فراڈ کر رہی ہیں۔ ایک کھلا ہوا فراڈ تو میری نگاہوں کے سامنے تھا جس سے میں نگاہیں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ انھوں نے کتنی خوب صورتی سے اپنی صاحب زادی کی خوب صورتی دکھائی تھی اور ایک عیب چھپا لیا تھا۔ میں دن کی روشنی میں واجدہ سے کتراتا تھا۔ جب وہ بھینگی آنکھوں سے دیکھتی تو یوں لگتا جیسے اپنی ماں کی طرف سے آنکھیں دکھا رہی ہو۔

میں نے ولیمے کے دن کا انتظار کیا۔ بیگم شائستہ مرزا مجھ جیسے داماد کو لاکھوں روپے دینے والی تھیں لیکن ولیمے کا دن گزر گیا۔ میں ان سے کچھ کہہ نہ سکا کیوں کہ مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ دوسرے دن ان کی صاحب زادی کو لے کر پھر ان کی قدم بوسی کے لیے پہنچا تو پتا چلا' وہ اچانک اسلام آباد چلی گئی ہیں۔ یہ سنتے ہی میں آپے سے باہر ہوگیا۔ میں نے واجدہ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بددیانتی ہے۔ کل آخری تاریخ ہے۔ اگر ادائیگی نہ ہوئی تو میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔"

واجدہ نے کہا۔ "آپ خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہیں۔ میری امی کبھی یہ برداشت نہیں کریں گی کہ ان کا داماد ہتھکڑیاں پہن کر جائے اور ہم سب کی بدنامی ہو۔"

میں نے اپنے سُسر بے چارے مرزا صاحب سے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ نے آپ کو میرے کیس کے متعلق کچھ بتایا ہوگا۔"

"بیٹے! میں ان معاملات کو نہیں سمجھتا۔ میں تو بس شوہر ہوں۔ وہ باہر جاتی ہیں' میں گھر کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ اس بار واپس آئیں گی تو مجھے شاید گھر سے باہر نکال دیں گی۔"

ان کی صاحب زادی نے پوچھا۔ "اباجان! خیریت تو ہے۔ کیا کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟"

"بیٹی! کل رات ہمارے ہاں سے نقدی اور زیورات چوری ہوگئے ہیں۔ صبح میں نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہے۔"

واجدہ نے کہا۔ "چور پہلے کبھی پکڑے گئے ہیں جو اب پکڑے جائیں گے۔ مال تو ہمارا گیا۔"

میں نے کہا۔ "ایسا بھی تو ہوسکتا ہے' ہماری خوشدامن صاحبہ وہ تمام زیورات اور نقد روپے اپنے ساتھ اسلام آباد لے گئی ہوں۔"

"آئرن سیف کے دونوں پٹ پوری طرح کھُلے پڑے ہیں۔ پولیس والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چوری کی واردات کی پوری تفصیلات لکھ کر یہاں سے گئے ہیں۔"

بیگم شائستہ مرزا کو ٹیلی فون کے ذریعے اس واردات کی اطلاع دی گئی۔ وہ دوسرے ہی دن پہنچ گئیں۔ چوری کی خبر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ جب بیگم صاحبہ نے اپنے گھر میں آکر آئرن سیف کو دیکھا تو غش کھاکر گر پڑیں۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ اُنھیں ہوش میں لایا گیا۔ واجدہ نے مجھ سے کہا۔ "میں امی کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی دیکھ بھال میں ہی کرسکتی ہوں۔ آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم انھیں اپنے ساتھ لے چلیں۔"

میں بھلا کیا اعتراض کرتا۔ مجھے اُن سے رقم وصول کرنا تھی۔ سوچا یہ میرے گھر میں رہیں گی تو میں تقاضا کرتا رہوں گا لیکن ان کی حالت بڑی نازک تھی' میں تقاضا نہیں کرسکتا



تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے اُنھیں یوں دیکھتا تھا جیسے بھولی ہوئی رقم کو یاد دلا رہا ہوں۔

ایک دن انھوں نے ڈاکٹر کے ذریعے کہلوا دیا کہ ان کا دل بہت کمزور ہے' لہٰذا کوئی دل شکنی کی باتیں نہ کرے یا ان کے دماغ پر کسی طرح کا بوجھ نہ ڈالے۔

بات صاف تھی کہ میں تقاضا نہ کروں۔ مجھے بڑا غصّہ آیا۔ دیکھنے میں تو وہ ہٹی کٹی لگتی تھیں بس مجھے دیکھتے ہی دل پکڑ لیتی تھیں اور کہتی تھیں۔ سر چکرا رہا ہے' دل ڈوب رہا ہے۔ ان کے لیے سیب کا مربہ' دودھ مکھن اور تازہ پھل روز منگوائے جاتے تھے۔ وہ میرا کھاتی تھیں اور بستر پر پڑے پڑے پھیلتی جاتی تھیں۔

ایک ماہ میں صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کب تک یہاں سے تشریف لے جائیں گی؟"

انھوں نے گھور کر پوچھا۔ "کیا مطلب' کیا میں تم پر بوجھ ہوں؟ کیا میں تمھاری ماں نہیں ہوں؟"

"آپ اگر میری ماں ہیں تو میرے ساتھ انصاف کریں۔ میری رقم کا کیا بنا؟"

"کیا انکم ٹیکس والوں نے تمھیں پریشان کیا ہے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں"۔

"کیا تمھارے ہاتھوں میں قانون کی ہتھکڑیاں لگ چکی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"پھر پریشانی کس بات کی ہے' تم کون سی رقم کا مطالبہ کر رہے ہو؟ سمجھ لو کہ تمھارے پندرہ لاکھ روپے ادا ہوچکے ہیں۔"

"کیسے ادا ہوگئے؟"

"اس طرح کہ انکم ٹیکس والے اب تمھیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے ہی اتنی بڑی رقم چاہتے تھے تو یہی سمجھو کہ میں نے ادا کردیئے اور تمھیں پریشانیوں سے نجات دلادی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا اور مجھ پر پندرہ لاکھ کا احسان رکھ دیا۔"

"کیسے کہہ سکتے ہو کہ پیسہ خرچ نہیں کیا ہے۔ کیا یہ سرکاری افسران اتنی آسانی سے مان لیتے ہیں۔ پورے دس ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔"

میں نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "پندرہ لاکھ کا معاملہ آپ نے صرف دس ہزار میں نمٹا لیا، مگر کیسے؟"

"میں 'ویری امپورٹنٹ لیڈیز ایسوسی ایشن' کی چیئرپرسن ہوں اور بہت سے اعلیٰ حکام تک میری رسائی ہے۔ میں نے کسی حاکم سے یہ نہیں کہا کہ پندرہ لاکھ روپے معاف کردیئے جائیں۔ میں نے تو انکم ٹیکس کے افسران پر صرف یہ رعب ڈالا ہے کہ میرے تعلقات کتنے وسیع ہیں۔ میں ان افسران کے دفتر میں بیٹھ کر بڑے بڑے عہدے داروں سے ٹیلیفون کے ذریعے گفتگو کرتی تھی اور وہ متاثر ہوکر میری باتیں سُنتے رہتے تھے۔ ابھی دس ہزار میں اس حد تک معاملہ نمٹ گیا ہے کہ تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ کوئی تمھیں گرفتار نہیں کرے گا۔ باقی تمھارے کلیئرنس سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے میں اور دس ہزار خرچ کردوں گی۔"

میں نے تھک ہار کر کہا۔ "چلیے، میں نے مان لیا کہ آپ نے میرے پندرہ لاکھ کا بوجھ ہلکا کردیا لیکن ہمارا معاملہ بیس لاکھ میں طے ہوا تھا۔ باقی پانچ لاکھ تو دیجیے۔"

"تمھیں شرم نہیں آتی۔ میرے گھر میں چوری ہوگئی۔ میں لٹ گئی، تباہ ہوگئی، برباد ہوگئی۔ تمھیں مجھ سے ہمدردی کرنا چاہیے اور تم مجھ سے یوں تقاضا کرتے ہو جیسے مجھے قرض دے رکھا ہو۔"

میں نے صوفے کے ہتھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہاں، قرضہ ہے۔ آپ نے پکے کاغذ پر تحریری بیان دیا ہے کہ مجھے بیس لاکھ روپے ادا کریں گی۔ میں چاہوں تو ان پندرہ لاکھ سے بھی انکار کرسکتا ہوں جو آپ نے مجھے ادا نہیں کیے ہیں۔"

"انکار کرکے دیکھ لو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمھارے انکم ٹیکس کا کیس اس طرح اچھال دوں گی کہ بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔"

"آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟"

"دھمکی تو تم دے رہے ہو۔ غضب خدا کا، ایک تو ہیرے جیسی بیٹی دی۔ اُس پر بھی



لاکھوں روپے کا مطالبہ۔ پہلے تمہارے پاس کیا تھا؟ تمھاری اتنی بڑی کوٹھی میں اُلّو بولتے تھے۔ اب ہم ماں بیٹی بول رہے ہیں۔ تمھیں تو احسان ماننا چاہیے ہمارا۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے جھگڑا ختم کردیجیے اور میرے وہ پانچ لاکھ دے دیجیے۔"

"میرے پاس ہوں گے تو ضرور دوں گی۔ جو کچھ میرا ہے، وہ میری بیٹی کا ہی ہوگا اور بیٹی کا ہوگا تو تمھارا ہوگا۔"

"کچھ ہوگا تو ہمارا ہوگا نا! پتا نہیں، واقعی چوری ہوئی تھی یا مجھے اور پولیس والوں کو اُلّو بنایا ہے۔"

"تم ہمیں بے ایمان سمجھ رہے ہو۔"

"آپ بے ایمان ہوں یا نہ ہوں، اتنا تو سمجھ گیا ہوں کہ آپ کے پاس کچھ نہیں رہا۔ ایک کوٹھی رہ گئی ہے۔ اس میں آپ کے شوہر صاحب رہتے ہیں۔ پتا نہیں کب تک رہیں گے۔ آپ کی صحت دیکھ کر یقین ہورہا ہے کہ وہ کوٹھی نہ آپ کی بیٹی کو ملے گی نہ مجھے۔"

"کیا تم چاہتے ہو، میں صحت مند نہ رہوں۔ مجھے کینسر ہوجائے، میں مرجاؤں، اور تمھیں میری کوٹھی مل جائے؟"

واجدہ نے کہا۔ "آپ میری امی کے متعلق ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"تمھیں اس بات پر افسوس نہیں ہورہا کہ تمھاری امی میری رقم ادا نہیں کررہی ہیں۔"

"حالات اچھے ہوتے تو میں امی سے ضد کرکے لے لیتی۔ آپ صبر کریں۔ آج نہ سہی، کبھی نہ کبھی وہ رقم ضرور ملے گی۔"

"پتا نہیں کس جنم میں ملے گی، میں صاف صاف کہے دیتا ہوں، اگر ایک ماہ کے اندر مجھے پانچ لاکھ روپے ادا نہ کیے گئے تو میں تمھیں طلاق دے دوں گا۔ تم دونوں ماں بیٹی کو گھر سے نکال دوں گا۔"

بیگم شائستہ مرزا نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا۔ "اے میاں صاحب زادے! اپنی اوقات میں رہو۔ میرے جیتے جی تم میری بیٹی کو طلاق نہیں دے سکو گے۔ دینا چاہو گے تو اس کوٹھی کو فروخت کرنا ہوگا۔ یعنی طلاق لے کر صرف میری بیٹی یہاں سے نہیں نکلے گی۔ تم بھی فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤ گے۔"

میں بھول گیا تھا' طلاق دینے کے بعد مجھے بیس لاکھ روپے مہر کے بھی ادا کرنا ہوں گے۔ میری ساس نے مجھے یاد دلایا تو ہوش ٹھکانے آگئے۔ اب اس میں شبہ نہیں تھا کہ میں بُری طرح اُن کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ میں نے بظاہر شکست تسلیم کرلی اور کیا کرتا۔ واجدہ کو طلاق نہیں دے سکتا تھا' میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی اور ماں بیٹی کو گھر سے نکال نہیں سکتا تھا۔ جبراً نکالنا چاہتا تو میری ساس پر دل کا دورہ پڑنے لگتا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا' ان کی دل شکنی نہ کی جائے۔ نہ ہی ان کے دماغ پر کسی طرح کا بوجھ ڈالا جائے۔

میں اندر ہی اندر غصّے سے کھول رہا تھا۔ ابتدا میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اپنے باقی پانچ لاکھ روپے چاہتا ہوں یا ساس نے میرے ساتھ جو کیا تھا' اس کا منہ توڑ جواب دینا چاہتا ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ سمجھ میں آگیا۔ دولت سب سے اہم ہے۔ اگر پانچ لاکھ مل جاتے تو ساس کو بھی برداشت کرلیتا۔ اب یہ رقم نہ ملنے کی صورت میں ایک پیسہ بھی خرچ کیے بغیر دونوں ماں بیٹی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں جتنا سوچتا تھا' اتنی ہی یہ بات دماغ میں مستحکم ہوتی جاتی تھی کہ واجدہ مرجائے تو اس کے ساتھ بیس لاکھ روپے مہر کا مطالبہ بھی مرجائے گا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ بیٹی کے مرنے کے بعد ساس مہر کا مطالبہ کرے کیونکہ اس سے کوئی رشتہ ہی نہیں رہ جاتا۔ پھر اُسے دھکے دے کر نکالنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ خود ہی چپ چاپ سر جھکا کر نکل جائے گی۔

میں جب بھی واجدہ کے مرنے کی بات سوچتا تو تصور میں اپنی ساس کی بے بسی دیکھ کر بے اختیار مسکرانے لگتا تھا۔ اسی طرح ہاری ہوئی بازی جیتی جاسکتی تھی۔ میری ساس نے انکم ٹیکس کے پندرہ لاکھ روپے کا مسئلہ حل کردیا تھا۔ اگر واجدہ اس دنیا سے اُٹھ جاتی



تو بڑی بی میرے گھر سے اٹھ جاتیں۔ یوں محترمہ سے کوئی رقم حاصل نہ کرنے کے باوجود میں پندرہ لاکھ کی جیت میں رہتا۔

کون پہلے مرتا ہے' کون بعد میں' یہ کوئی نہیں جانتا میں بھی واجدہ کے بارے میں یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ کب مرے گی۔ اس سے نجات پانے کے لیے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ ایذا پہنچانے والے خود نہ مریں تو اُنھیں مار ڈالنا چاہیے۔ وہ ماں بیٹی میرے لیے ایک مصیبت بنتی جارہی تھیں۔ میں کماتا تھا وہ کھاتی تھیں' اس پر بھی رُعب جماتی تھیں۔ نخرے دکھاتی تھیں۔ یہ نہیں کھائیں گی' وہ نہیں کھائیں گی۔ خوشدامن صاحبہ پہلے ہی ویری امپورٹنٹ لیڈی' بنی ہوئی تھیں۔ گھر کا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتی تھیں۔ کچن میں جانا اُن کی شان کے خلاف تھا۔ میں نے ملازم اور ملازمہ کو نکال دیا تھا۔ ابتدا میں واجدہ گھر کا کام سنبھالتی رہی پھر اُس نے بھی نخرے دکھائے۔ یقیناً اُس کی ماں اُسے بہکاتی ہوگی۔ دونوں ہی میرے پیچھے پڑگئیں کہ اتنے بڑے گھر میں کم از کم ایک ملازمہ ضروری ہے۔

میری خوش دامن نے کہا۔ "بیٹی! ملازمہ نہیں' ملازم رکھو۔ تم ابھی ناتجربہ کار ہو جب گھر میں میاں سے بنتی نہ ہو تو کبھی کسی ملازمہ کو نہیں رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے کہ جب بیوی سے بنتی نہ ہو تو گھر میں ملازم نہیں رکھنا چاہیے۔"

وہ بھڑک کر بولیں۔ "تم میری بیٹی کو چھچھورا سمجھتے ہو؟"

"کیا آپ مجھے چھچھورا سمجھتی ہیں؟ اس گھر میں ملازم کبھی نہیں آئے گا۔ آئے گی' تو صرف ملازمہ آئے گی۔"

واجدہ نے کہا۔ "امی آپ جھگڑا نہ کریں' ہم کسی بوڑھی عورت کو رکھ لیں گے۔"

میں نے اعتراض کیا "ہرگز نہیں' بوڑھی عورت مستعد نہیں ہوتی' جلدی تھک جاتی ہے۔ یہاں جوان ملازمہ رکھی جائے گی تاکہ وہ نچلی منزل سے اوپری منزل تک بھاگ دوڑ میں تھکنے نہ پائے"

ایک ملازمہ کے مسئلے پر ہمارے درمیان کئی دنوں تک بحث چلتی رہی۔ ایک دن

میری خوشدامن نے کہا۔ "اگلے ہفتے تمھاری شادی کی سالگرہ ہے۔ میں چاہتی ہوں خوب دھوم دھام سے یہ سالگرہ منائی جائے۔"

"میں اپنی موت کا جشن نہیں مناؤں گا۔ میری شادی نہیں بربادی ہوئی ہے۔"

میں اُن کی کسی بات سے اتفاق نہیں کرتا تھا' لیکن واجدہ نے پیار محبت سے مجھے سمجھا لیا۔ مجھے قائل کرلیا کہ شادی کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔ بارہا جی چاہا کہ اُس کی گردن دبوچ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کردوں لیکن قانون سے ڈرتا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو ہتھکڑی سے بچانے کے لیے تو میں نے ایک ساس کی مصیبت مول لی تھی۔ اب اُس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بیوی کو قتل کرتا تو وہی ہتھکڑی پھر میرے ہاتھوں تک پہنچ جاتی۔

اس سلسلے میں سوچتے سوچتے کسی کرائے کے قاتل کی طرف دھیان جاتا تھا پھر سوچتا تھا' وہ کمبخت قاتل بھی تو ناکام ہوسکتا ہے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ واجدہ دوسری طرف دیکھ رہی ہے۔ اُسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ بھینگی اُسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ اُس کے حملے سے بچ جائے گی۔ بھینگے پن کا یہی ایک بڑا فائدہ ہے۔ دوست ہو یا دُشمن' اُس کی نگاہوں کا تعین نہیں کرسکتا۔

سوچتے سوچتے سالگرہ کا دن آگیا۔ بڑی زبردست تیاریاں کی گئی تھیں۔ بڑے بڑے لوگوں کو دعوتیں دی گئی تھیں' سبھی شریک ہوئے تھے۔ میری کوٹھی کے نچلے حصّے سے اُوپری حصّے تک مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ہر جگہ کھانے کی ڈشوں کے لیے اسٹینڈ رکھے ہوئے تھے۔ سب چلتے پھرتے اپنی اپنی پسند کا کھانا لے کر کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد سویٹ ڈش کے علاوہ موسم کے تازہ پھل بھی تھے۔ ایک کیلا کھاتے وقت اچانک میں نے واجدہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور سہیلی سے کہہ رہی تھی۔

"اپنا ہی گھر سمجھو' کھانے میں تکلف نہ کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف بتادو۔"

اُس کی سہیلی نے قہقہہ لگایا۔ واجدہ بھی جواباً ہنستے ہوئے اپنی ماں کے ساتھ زینے کی طرف جانے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگوں کی نظریں بچاکر کیلے کے چھلکے کو زینے کے اُوپری سرے کی طرف پھینک دیا۔ مجھے یقین تھا' میری ساس کا پاؤں پڑے گا۔ اس



کے ساتھ ہی میں اُن ماں بیٹی کے پیچھے ذرا فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

میری خوش دامن قسمت کی دھنی تھی۔ اس کا پاؤں چھلکے پر نہیں پڑا' وہ بخیریت گزر گئی۔ اب اُس کے پیچھے واجدہ تھی۔ اُس کا پاؤں ضرور چھلکے پر پڑنا چاہیے تھا۔ میں احتیاطاً اُس کے پیچھے چلا آیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ بھی بچ کر نکل رہی ہے تو اپنا ہی پاؤں کیلے کے چھلکے پر رکھ کر واجدہ کو زینے پر سے دھکا دیتے ہوئے خود پھسل پڑا۔

واجدہ کی ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ وہ زینے کے ایک ایک پائیدان پر سے لڑھکتی ہوئی پستی کی طرف جارہی تھی۔ کتنے ہی لوگ اُس کی طرف لپکے لیکن اُس وقت تک وہ زینے کے نچلے سرے تک پہنچ چکی تھی۔

اوپری سرے پر میں گرا پڑا تھا اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ کچھ لوگ مجھے سہارا دے کر اُٹھا رہے تھے اور کچھ لوگ واجدہ کے اطراف جمع ہوگئے تھے۔ ایک عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

میری ساس اپنے سینے پر ہاتھ مار کر ماتم کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "ہائے ہائے' یہ کیا ہوگیا۔ میری پھول جیسی بچّی اوپر سے گری ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کس نے گرایا ہے اسے۔"

وہ اُوپر کی طرف سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے سہارا دینے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "کسی نے نہیں گرایا۔ یہ محض ایک اتفاقیہ حادثہ ہے۔ اِدھر ان کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر پڑا۔ یہ سنبھلنا چاہتے تھے لیکن واجدہ کو دھکا لگ گیا۔"

میری طرف سے صفائی پیش کیے جانے کے باوجود میری ساس مجھے بُری طرح گھور رہی تھیں۔ اُن کے گھورنے سے کیا ہوتا تھا۔ میں اپنا کام کرگیا تھا لیکن کام اناڑی پن سے ہوا تھا۔ واجدہ کو دیکھنے والے کہہ رہے تھے کہ وہ صرف بے ہوش ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی اُس کی زندگی باقی ہے۔

کیا زینے کی بلندی سے گرنے والے مرتے نہیں ہیں؟ میں نے فلموں میں تو یہی دیکھا ہے۔ زینے سے گرنے والے یا تو اپنی یادداشت کھو دیتے ہیں یا مرجاتے ہیں۔ میں ایک شوہر کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کے لیے بھاگ

دوڑ کر رہا تھا لیکن ڈاکٹر نے یہ منحوس خبر سنائی کہ واجدہ ہوش میں آگئی ہے۔

ڈاکٹر کا قصور نہیں تھا' قصور میرا تھا۔ اگر میں دھکا نہ دیتا' اُسے اٹھا کر زینے پر دے مارتا تو یقیناً مرجاتی مگر ایسا میں کر نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ہمدردی سے کہا۔ "اب میں جو کہنے جارہا ہوں' اُسے آپ دل مضبوط رکھ کر سُنیں۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنی مسرتوں کو دباتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اُس نے کہا۔ "آپ کی شریکِ حیات بُری طرح زخمی ہوئی ہیں۔ اُن کے دونوں گھٹنے ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہڈیوں کو برابر کر کے پٹی باندھ دی ہے لیکن فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔"

اُسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ دوسری صبح اُس کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم نے پوری کوشش کی ہے۔ پلاستر چڑھا دیا ہے۔ گھٹنے صحیح تو ہوجائیں گے لیکن یہ اپنے پیروں سے چل نہیں سکیں گی۔"

گویا اسے زینے سے دھکا دے کر میں نے نئی مصیبتیں مول لے لی تھیں۔ پہلے وہ گھر کا کام کرلیتی تھی۔ اب بستر سے اُٹھ نہیں سکتی تھی۔ اُسے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے وھیل چیئر لائی گی تھی۔ وہ بڑی شان سے پہیے والی کُرسی پر بیٹھ کر اِدھر سے اُدھر جاتی تھی جیسے ملکۂ عالیہ ہو۔ جب تک میں گھر میں رہتا' وہ مجھ سے ضد کرتی' میں فلاں کھڑکی کے پاس جاؤں گی۔ اُدھر بالکونی میں لے چلو اور میں اُس کی پہیوں والی کُرسی کو دھکیلتا ہوا اِدھر سے اُدھر لے جاتا تھا۔ پہلے شوہر تھا' اب ملازم بن گیا تھا۔

کبھی جی میں آتا کہ اُسے پہیوں والی کُرسی سے کھینچ کر نیچے پھینک دوں' ایک ٹھوکر مار کر کہوں۔ "یہیں پڑی رہو اور اپنے نصیبوں کو روتی رہو۔"

لیکن میری خوشدامن صاحبہ ویری امپورٹنٹ لیڈیز ایسوسی ایشن کی چیئرپرسن تھیں۔ حقوقِ نسواں کی علمبردار۔ بھلا میں اُن کی بیٹی پر ظلم کیسے کرسکتا تھا۔ وہ مجھے عدالت تک گھسیٹ کر لے جاسکتی تھیں۔ عدالت میں مجھے بدنام کرسکتی تھیں۔ مجھ پر اس طرح کیچڑ اُچھالتیں کہ میں اُونچے طبقے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ سب مجھے ظالم اور



جابر کہتے اور میری بیوی اور ساس مظلوم کہلاتیں۔

ویسے میں نے اپنی ایک بات منوالی تھی۔ اُنھیں ایک نوجوان ملازمہ کو رکھنا پڑا جو بہت تیز و طرار تھی' پٹاپٹ بولتی تھی مگر کالی تھی۔

میری ساس نے خوب سوچ سمجھ کر کالی ملازمہ کا انتخاب کیا تھا۔ اُس کے مقابلے میں اُن کی بیٹی گوری اور چاندی کی طرح چمکتی ہوئی تھی لیکن وہ بھول گئی تھیں کہ جوانی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ جوانی دن کا نور بھی ہوتی ہے اور رات کی تاریکی بھی۔ ویسے وہ اتنی کالی بھی نہیں تھی کہ اندھیرے میں دکھائی نہ دیتی۔ اس سے میری پہلی ملاقات اندھیرے میں ہوئی' جب میں باہر سے آیا تو بجلی گئی ہوئی تھی۔ میں نے کار کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں دیکھا' کوئی عورت بیرونی دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ میں گاڑی سے اُتر کر دروازے کے قریب پہنچا' اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"صاحب جی! میں فیروزہ ہوں۔ آپ کی ملازمہ۔"

اسی وقت بجلی آگئی۔ سب سے پہلے میری نظر اُس کی آنکھوں پر پڑی۔ کیا خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچا۔ میری ساس نے بہت بڑی غلطی۔ وہ یہ بھول گئی تھیں' میں بھینگی آنکھوں کا مارا ہوں۔ سیدھی اور شفاف آنکھوں کی گہرائیوں میں اُتر جاؤں گا۔

گورے اور کالے رنگ میں یہ فرق بھی ہے کہ گورا رنگ پہلی نظر میں گرفتار کرلیتا ہے جب کہ کالا رنگ فوراً متاثر نہیں کرتا لیکن قریب رہنے کا موقع ملے' تو آہستہ آہستہ متاثر کرتا چلا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں گورا رنگ دریا کی طرح لہریں مارتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ڈبوتا ہے مگر وہاں سے اُبھر کر کنارے تک پہنچنے کی آس رہتی ہے۔ کالا رنگ سمندر ہے۔ گہرائی میں ڈوبنے کے بعد پھر اُبھرنے اور پار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریکی میں گم ہوکر روشنی کا سراغ پانے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

پہلے دن میں نے اس ملازمہ پر سختی سے اعتراض کیا۔ غصے سے کہا۔ "یہ کوئی ملازمہ ہے۔ نہ رنگ نہ روپ' تم ماں بیٹی اچھی طرح جانتی ہو' میں اپنے گھر کی سجاوٹ میں بھی

حُسن چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے واجدہ جیسی حسین شریکِ حیات کا انتخاب کیا۔"

یہ کہتے وقت میں نے اُس کی بھینگی آنکھوں کو نظرانداز کر دیا تاکہ دونوں ماں بیٹی خوش ہو جائیں۔ میری ساس نے کہا۔ "ہم تمھارے حسن نظر کو سمجھتے ہیں' اسی لیے تو کھڑکی دروازوں پر ہر ہفتے خوب صورت پردے ڈالتے ہیں۔ گھر میں خوب صورت فرنیچر' تصاویر اور سجاوٹ کا قیمتی سامان رکھتے ہیں۔ جس سے تمھارے حسن نظر کی تسکین ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن نوکر اور نوکرانیاں بھی دیکھنے' سمجھنے میں اچھے ہونا چاہئیں۔ اتنی خوب صورت کوٹھی میں ایک کالی ملازمہ کتنی بُری لگے گی۔"

"انگریز قوم کو دیکھو' وہ کیسے گورے چٹے ہوتے ہیں۔ وہ بھی حسن نظر رکھتے ہیں لیکن اپنے گھروں میں حبشی غلاموں اور حبشی کنیزوں کو پسند کرتے ہیں۔"

"وہ پسند کرتے ہوں گے' لیکن میں تو اس ملازمہ کو اندھیرے میں دیکھتے ہی ڈر جاؤں گا۔ توبہ توبہ' کیسی خوف ناک لگتی ہے۔"

"تم جوان ہو' بچے نہیں ہو۔ یہ ملازمہ اُسے ڈرانے کے لیے رکھی گئی ہے جو بچکانہ حرکت کرے گا۔"

میری ساس نے یہ کہہ کر فاتحانہ انداز میں اپنی صاحبزادی کو دیکھا۔ میں جھنجلا کر وہاں سے چلا آیا۔ میرا کمرہ نچلی منزل میں تھا۔ میرے پیچھے ساس صاحبہ بھی چلی آئیں۔ اُس نے فیروزہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اوپر بیگم صاحبہ اکیلی ہیں۔ اُن کے پاس جاؤ۔"

وہ اوپر چلی گئی۔ ساس صاحبہ نے بڑی محبت سے کہا۔ "بیٹے منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمھارے لیے کھانا لگا رہی ہوں۔"

میرے لیے اُنھوں نے کھانا لگایا۔ پھر چائے بنا کر لائیں اور اُس وقت تک نچلی منزل میں رہیں جب تک ملازمہ موجود رہی۔ اُس کے لیے ڈیوٹی کا وقت صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک مقرر کیا گیا تھا۔ چونکہ پہلا دن تھا' اس لیے وہ نو بجے تک رہی' پھر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میری ساس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا اور اپنی بیٹی کے پاس چلی گئیں۔ میں



نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر سوچا۔ آخر یہ مجھے کیا سمجھتی ہیں۔ کیا میں اتنا چھچھورا ہوں کہ ایک ملازمہ کو منہ لگاؤں گا' وہ بھی کالی کلوٹی ملازمہ کو۔

میرے اندر بغاوت جنم لے رہی تھی۔ کوئی مجھ میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا' اگر یہ ملازمہ کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں تو مجھے اس کے قریب جانا چاہیے۔ اُن کی نگرانی اور پہرے داری کے باوجود اُن کا منہ چڑانا چاہیے۔

محض منہ چڑانے کی خاطر میں گھر سے نکل پڑا۔ بیرونی دروازے کو چپکے سے بند کیا تاکہ اُوپر میرے جانے کی آہٹ نہ پہنچے کار بھی وہیں چھوڑ دی۔ کوٹھی کے احاطے سے نکل کر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ مجھے معلوم تھا' وہ غریب ہے' یقیناً بس کے ذریعے آتی جاتی ہوگی اور ہمارے علاقے میں بس اسٹاپ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

جب میں اسٹاپ پر پہنچا تو وہ تنہا تھی۔ اتنی رات کو بہت کم مسافر اسٹاپ پر نظر آتے ہیں۔ میں اُسے دیکھتے ہی رُک گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ فیروزہ کو میں نے گھر کے اندر جس حالت میں دیکھا تھا' اس سے وہ بالکل مختلف تھی۔ اُس کے بدن پر ڈھیلا ڈھالا لباس نہیں تھا۔ سلیقے سے تراشے ہوئے لباس میں اُس کا سراپا یوں نکھر آیا تھا کہ اُس کے کالے رنگ پر نظر ہی نہیں جاتی تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔

"آ........... آپ یہاں کیسے؟"

"کیوں میرے آنے پر اعتراض ہے؟"

"جی نہیں' مگر کیا بڑی بیگم صاحبہ بھی آئی ہیں؟"

وہ میری ساس کو بڑی بیگم صاحبہ کہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "وہ نہیں ہیں' مگر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"جی' میں کیا بتاؤں۔ آپ اپنی وائف کو اور اپنی ساس کو مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔"

"جانتا تو ہوں مگر تمھاری زبان سے بھی سننا چاہتا ہوں۔"

"اُنھوں نے اس شرط پر ملازمت دی ہے مجھے کہ آپ مجھے کسی صورت میں پسند نہ کریں، مجھ سے بیزار رہیں، مجھ سے دور رہیں، اگر آپ سے کبھی مسکرا کر ایک بات بھی کرتے دیکھ لیا انھوں نے تو اُسی وقت ملازمت سے نکال دی جاؤں گی۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "تمھارا کیا خیال ہے، کیا میں تم سے بیزار ہو سکتا ہوں؟"

"جی، جی مگر وہ آپ کی بیگم صاحبہ اور آپ کی ساس صاحبہ کہتی ہیں کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ عورتوں کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔"

"اگر میں تمھیں اچھی نظر سے دیکھوں تو؟"

"پھر بھی میری شامت آجائے گی۔"

"فیروزہ! مجھے یہ بتاؤ، میں کیا کروں۔ تمھیں بُری نظر سے دیکھوں گا تب بھی بُرا کہلاؤں گا۔ اچھی نظر سے دیکھوں گا، تب بھی مجھ پر الزام آئے گا۔ دراصل جن کی نظریں بُری ہوتی ہیں، وہ دوسروں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ کیا میں تمھیں بُرا آدمی لگتا ہوں؟"

اُس نے آہستہ آہستہ پلکیں اٹھا کر میری دیکھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ واجدہ چھ ماہ سے بستر پر پڑی ہے۔ حقیقتاً نہ وہ میری بیوی ہے، نہ میں اُس کا شوہر ہوں۔ اُس نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ پھر میری بات کا جواب دیا۔ "جی نہیں، آپ بُرے آدمی نہیں۔ آپ تو بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"پھر وعدہ کرو مجھ سے نہیں ڈرا کرو گی۔"

"میں اپنی نوکری کی وجہ سے ڈرتی ہوں۔ ہم بہت غریب ہیں۔ میرا باپ بیمار ہے۔ میں دو وقت کی روٹیوں اور اس کے علاج کے لیے ملازمت کر رہی ہوں۔"

"تم روزگار کی فکر نہ کرو۔ تمھاری ملازمت یہاں پکی ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم نکالی جاؤ گی تو میں ضمانت دیتا ہوں، تمھارے گھر کا چُولھا کبھی نہیں بجھے گا۔ تمھارے باپ کا باقاعدہ علاج ہوتا رہے گا۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوچھا۔ "آپ مجھ پر مہربان کیوں ہیں؟"

"ابھی تو تم نے کہا تھا، میں اچھا آدمی ہوں۔ کیا اچھے آدمی دوسروں پر مہربانی نہیں کرتے؟"



اس نے ہاں کے انداز میں سرہلایا، پھر کہا۔ "مگر........."

میں نے پوچھا۔ "مگر کیا؟"

"میں اکیلی ہوں اور بہت دل مضبوط کر کے ملازمت کے لیے گھر سے نکلی ہوں۔ مجھے معلوم ہے، میں خوب صورت نہیں ہوں۔ اس کے باوجود لوگ بدصورت لڑکیوں کا بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اگر میں لوگوں کی طرف مائل نہیں ہوں گی تو محبت کا جال پھینکیں گے۔ طرح طرح کی مہربانیاں کریں گے۔ مجھے آپ سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

"اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک آدمی تو ایسا ہوگا، جس سے تم نہیں ڈرو گی۔"

"ہاں، وہ میرا جیون ساتھی ہوگا لیکن کوئی ایسا ہوگا، مجھے یقین نہیں ہے۔ کون مجھے پسند کرے گا، کون مجھے تمام عمر اپنے ساتھ لے کر چلے گا؟"

"تم بہت اچھی ہو، احساسِ کمتری میں مبتلا ہو۔ محض رنگ گورا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ تم کسی سے کم تو نہیں ہو۔"

وہ سر جھکائے دوپٹے کے آنچل سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "مجھ میں بھلا کیا خوبی ہے؟"

"میں تمھاری خوبیاں بیان کروں گا تو کہو گی، تمھاری جھوٹی تعریفیں کر کے تمھیں احمق بنا رہا ہوں۔"

وہ آہستگی سے بولی۔ "جو خودغرض ہوتے ہیں، وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کو احمق بناتے ہیں۔ بھلا آپ کی غرض مجھ سے کیا ہوگی؟ میں تو ایک معمولی سی ملازمہ ہوں۔"

"اگر تم مجھے خودغرض نہیں سمجھتی ہو، میری تعریفوں کا بُرا نہیں مانو گی تو صدقِ دل سے کہتا ہوں، تمھارے چہرے کے جو نقوش ہیں، وہ میں نے آج تک کسی لڑکی میں نہیں دیکھے۔ تم نے اپنی غزالی آنکھوں کو آئینے میں بچپن سے دیکھا ہوگا میں نے آج یہ آنکھیں دیکھی ہیں، جب تم دیکھتی ہو تو یوں لگتا جیسے کسی بازی کے بغیر جیت رہی ہو۔"

پتا نہیں وہ میری تعریف سے شرما رہی تھی، گھبرا رہی تھی یا کترانا چاہتی تھی۔ بار بار سر پر آنچل کو دُرست کرتی تھی اور اُسے گھونگھٹ کی طرح کھینچ لیتی تھی تاکہ میں چہرے کے تاثرات کو نہ پڑھ سکوں۔ اسی وقت بس آگئی، وہ لپک کر زنانہ درجے میں چلی گئی۔

میں کھڑکی کے پاس آگیا۔ وہ نظر آرہی تھی مگر نظریں چُرا رہی تھی۔ اُسی وقت بس چل پڑی' میں اپنی جگہ کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب بس نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں آہستہ آہستہ اپنی کوٹھی کی طرف واپس چل دیا۔ میرے دل نے سوال کیا' کیا واقعی فیروزہ حسین ہے اور میں اُس کا دیوانہ ہوں؟

جہاں تک اس کے حُسن و خوبیوں کا تعلق تھا تو میں نے صدقِ دل سے اُن کی تعریف کی تھی۔ حُسن کو رنگ سے الگ کر کے دیکھا جائے تو فیروزہ میں خطرناک حد تک جاذبیت تھی۔ دل آپ ہی آپ کھنچا جاتا تھا۔ وہ بالکل کالی نہیں تھی۔ گوروں کی بستی میں کالی لگتی تھی۔ حقیقتاً سانولی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا نمک تھا۔ میں نے سوچا' کچھ روز میرے ہاں رہے گی تو اور نمک چڑھے گا۔

میں چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ ایک کار کی ہیڈلائٹس مجھ پر پڑ رہی تھیں پھر وہ کار میرے سامنے آکر رُک گئی۔ اُس کا دروازہ کھول کر ایک صاحب باہر نکلتے ہوئے بولے۔ "بھئی بڑی عمر ہے تمھاری۔ ابھی میں تمھارا ہی ذکر کر رہا تھا۔"

میری آنکھوں پر روشنی پڑ رہی تھی۔ میں اُنھیں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن آواز سے پہچان لیا۔ وہ اس شہر کے اے کلاس کنٹریکٹر اور انجینئر کنور آفتاب خلجی تھے۔ اُسی وقت ہیڈلائٹس بجھ گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کھانے کے بعد ٹہلنے نکلے ہو۔ چلو ذرا سمندر کے کنارے چلیں۔"

میں اُن کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر دو آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ یقیناً ان کے کاروبار سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں گے۔ اُنھوں نے سمندر کی طرف گاڑی کو موڑتے ہوئے کہا۔ "پچھلی بار تم نے ٹیکسٹائل ملز کی مشینیں لگوانے کے لیے جو کاریگر اور مزدور فراہم کیے تھے' اُنھوں نے تو کمال کردیا۔ ایک مہینے کا کام تھا' بائیس دن میں مکمل ہوگیا۔"

"میں نے کہا۔ "میں ٹھوک بجا کر لوگوں کا انتخاب کرتا ہوں۔"

"مجھے تمھاری یہی خوبیاں پسند ہیں۔ جانتے ہو' میں تمھیں ایک بہت بڑا ٹھیکہ دینے والا ہوں۔"



میں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے ٹھیکیداری سے اتنی خوشی حاصل نہیں ہوتی' جتنی آپ کی خدمت کر کے ہوتی ہے۔"

کنور آفتاب خلجی نے خوش ہو کر کہا۔ "تو پھر میری ہی خدمت کرنے کے لیے خوش ہو جاؤ۔ ہمیں اسٹیل ملز کی بھاری مشینیں نصب کروانے کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ اس کے لیے تمام کاریگر اور مزدور تم سپلائی کرو گے۔"

"ضرور کروں گا اور کوئی حکم؟"

"میں نے بھاری مشینیں انسٹال کرنے کے لیے چھ ماہ کا وقت لے لیا ہے۔ تم کتنے مہینوں میں کر سکو گے۔"

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ "آپ نے وہ مشینیں دیکھی ہوں گی' اپنے تجربات سے اندازہ کیا ہوگا۔ اگر وہ چھ مہینے کا کام ہے تو میں اسے چار ساڑھے چار مہینے میں مکمل کرانے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے یقین ہے' تم ایسا ہی کرو گے۔ دوسرے ٹھیکیدار تو دیوالا نکال دیتے ہیں' چھ مہینے کا کام سال بھر میں کرتے ہیں اور پیسے بناتے رہتے ہیں۔ تم لالچی نہیں ہو' اسی لیے میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔"

"شکریہ' میں ہمیشہ آپ کے اعتماد کو برقرار رکھوں گا۔"

"یہ نہ سمجھنا کہ چار ساڑھے چار ماہ کے بعد ہمارا ٹھیکہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں بجلی کا سب اسٹیشن قائم کرنے اور پورے اسٹیل ملز میں وائرنگ کرنے کا بھی ٹھیکہ ہمارے پاس ہے۔ اس سے متعلق صرف کاریگر اور مزدور ہی نہیں بلکہ جتنا مال میٹریل ہوتا ہے وہ بھی تم ہی سپلائی کرو گے۔"

میں کار میں بیٹھا ہوا تھا مگر ہواؤں میں اُڑا جا رہا تھا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اچانک ہی مجھے اتنا بڑا کنٹریکٹ مل جائے گا۔ ایک اندازے کے مطابق میں سال بھر میں ساٹھ ستر لاکھ روپے پیدا کر سکتا تھا۔

میں اُن کے ساتھ سمندر کے ساحل پر دیر تک ٹہلتا رہا۔ ان دنوں ہمارے ملک میں شراب پر پابندی نہیں تھی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں شخص کنور آفتاب خلجی کے چمچے ثابت

ہوئے۔ وہ شراب کی بوتلیں ریت میں دبا دیتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر میں ہمارے لیے پیگ بنا کر لاتے تھے۔ ہم پی رہے تھے اور موجودہ ٹھیکے کے نشیب و فراز پر گفتگو کرتے جارہے تھے۔ رات کے ایک بجے کنور آفتاب خلجی نے میری کوٹھی کے سامنے مجھے چھوڑ دیا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں میری ساس دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے گھور رہی تھی۔ زینے کے اوپری حصے میں واجدہ نظر آئی۔ وہ وھیل چیئر پر بیٹھی بالکونی کی ریلنگ سے لگی دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے ایک بار اُسے' دوسری بار اپنی ساس کو حقارت سے دیکھا۔ اب میں اتنا بڑا آدمی بننے والا تھا جس کے متعلق میری ساس کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ دونوں فوراً مرجائیں۔ ان سے میرا پیچھا چھوٹ جائے اور میں نئے سرے سے ایک حسین شریکِ حیات کے ساتھ زندگی شروع کروں۔

میری ساس نے غرا کر پوچھا۔ "تم نے جواب نہیں دیا' اتنی رات تک کہاں تھے؟"

"میں کہیں بھی تھا' تم مجھ سے پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟"

وہ ایک دم سے چونک کر حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آج تم نے مجھے' تم' کہا ہے؟"

"یہ وارننگ ہے کہ اپنی حد میں رہو' ورنہ بات' تُو' تک بھی پہنچ سکتی ہے۔"

واجدہ نے اوپر سے کہا۔ "امی! آپ خاموش رہیں۔ دیکھتیں نہیں' یہ نشے میں ہیں۔ خوامخواہ بات بڑھے گی۔"

پھر اس نے نرمی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے پاس آجائیں۔ پلیز بتائیں کہاں گئے تھے؟ ہم آپ کے لیے پریشان تھے۔"

"میں تم لوگوں کی پریشانی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم لوگوں کے دماغ میں کیڑا کلبلا رہا تھا کہ میں شاید اس کے پیچھے گیا ہوں۔ اگر میں بتادوں کہ کہاں گیا تھا تو تم دونوں کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"



دونوں نے چونک مجھے دیکھا جیسے کوئی خطرے کی گھنٹی بج رہی ہو۔ واجدہ نے کہا۔

"پلیز' آپ میرے پاس آجایئے۔ آپ جہاں بھی گئے ہوں' آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ میں تو امی سے بار بار کہتی ہوں کہ میں معذور ہوچکی ہوں' اب میں اپنے ہاتھوں سے آپ کی دوسری شادی کراؤں گی۔ آپ کے لیے دُلہن لاؤں گی۔"

اس کی باتوں کے دوران میں اوپری زینے پر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں تمھیں بہت چاہتا ہوں۔ تمھاری سوکن کبھی نہیں لاؤں گا۔ تمھاری ماں نے ہماری زندگی برباد کردی ہے۔ ہمارے درمیان اعتماد کے بجائے بے اعتمادی پیدا کردی ہے۔"

میری ساس سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی' میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یو شٹ اپ' میاں بیوی کے درمیان کچھ بولو گی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

پھر میں نے واجدہ کا ہاتھ ڈرامائی انداز میں تھام کر ایک محبت کرنے والے شوہر کی طرح کہا۔ "میں تمھیں چھوڑ کر کبھی اتنی رات کو باہر نہیں گیا۔ آج اچانک ایک کاروباری مسئلے کی وجہ سے جانا پڑگیا۔ جانتی ہو مجھے کتنا بڑا ٹھیکہ ملا ہے؟"

میری ساس نے کہا۔ "یہ جھوٹ بولتا ہے' تمھیں بہلا رہا ہے' کون اتنی رات کو ٹھیکہ دینے آتا ہے؟"

میں نے اُس کی وھیل چیئر کو پیچھے سے تھام لیا۔ پھر اُسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے آیا۔ ٹیلی فون کے پاس پہنچ کر کہا۔

"یہ ٹیلیفون رکھا ہے۔ کنور آفتاب خلجی کے نمبر ڈائل کرو اور اُن سے پوچھو' کیا میں میں ابھی اُن کے ساتھ تھا یا نہیں اور اگر تھا تو ہمارے درمیان کس قسم کی کاروباری گفتگو ہوتی رہی ہے؟"

واجدہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میرے فون کر کے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے شوہر پر اعتماد نہیں کرتی ہوں۔ میں ہرگز ایسی حماقت نہیں کروں گی۔ آپ جو کہہ رہے ہیں' مجھے اس پر یقین ہے۔"

"تم یقین کرو مجھے لاکھوں روپے کا ٹھیکہ ملا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہم بہت جلد کروڑ پتی بن

جائیں گے۔"

میری ساس دروازے پر کھڑی سُن رہی تھی۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھی۔ "میرے بیٹے! میں غلطی پر تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ تم دن رات کاروباری معاملات میں اُلجھے رہتے ہو۔ میں آئندہ تمہارا پورا خیال رکھوں گی۔"

"جو خیال رکھ رہی ہیں' اسی سے بیزار ہوں۔ یہ کوئی تُک ہے کہ نئی ملازمہ آئی اُسے واجدہ کے پاس بھیج دیا اور خود ملازمہ کی طرح میری خدمت کرتی رہیں۔ اگر میں ایسے میں آپ کے بجائے تم کہتا ہوں تو کیا غلطی کرتا ہوں؟"

اُنھوں نے میری بلائیں لے کر کہا۔ "ہائے بیٹا! تم مجھے تم کیا' تُو کہہ سکتے ہو۔ رشتے میں داماد ہو مگر میں بیٹا سمجھتی ہوں اور بچوں کی غلطیاں تو بڑے معاف کر ہی دیا کرتے ہیں۔ جب بھی تم مجھے تُو کہو گے' میں تمھیں معاف کر دیا کروں گی۔"

وہ بڑی محبت جتا رہی تھی۔ ساس آخر ساس ہوتی ہے' ماں نہیں بن سکتی۔ اگر وہ ماں بننا بھی چاہتی تو میں اس سے انکار کر دیتا۔

اس رات مجھے نئے ٹھیکے ملنے کی خوشی میں نیند نہیں آسکی تھی۔ اس لیے میں نے خواب آور گولیاں کھائیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ بڑی گہری نیند آئی۔ علی الصبح خواب میں جانے کیسے فیروزہ کو دیکھ لیا۔ حالاں کہ اُسے اپنے دماغ سے جھٹک دیا تھا۔ لاکھوں کی ہونے والی آمدنی کے سامنے اُسے بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ پھر جانے وہ کیسے میرے خواب میں چلی آئی۔ اسے ماہرینِ نفسیات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تھوڑی نفسیات مجھے بھی آتی ہے۔ شاید وہ میرے لاشعور کے کسی خانے میں چھپی ہوئی تھی جو خواب میں اُبھر آئی تھی۔

عورت زندگی میں آئے یا خواب میں' اپنی اہمیت ضرور جتاتی ہے۔ فیروزہ نے کہا۔ "جانتے ہو' یہ نیا ٹھیکہ میرے نصیب سے ملا ہے۔ میں نے ابھی تمھارے گھر کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ میں خوش قدم ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ میری طرف سے منہ پھیر کر جانے لگی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "رُک جاؤ۔ میں نہیں چاہتا' تمھارے قدم میری دہلیز سے واپس جائیں۔"



میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر بولی۔ "میں جا رہی ہوں۔ تمھیں وقت ہی بتائے گا کہ میرے آنے سے تمھاری قسمت جاگی ہے۔ جانے سے سو یہ جائے گی۔"

وہ چلی گئی۔ اچانک ہی میری آنکھ کُھل گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ میں بستر پر گُم صم پڑا سوچ رہا تھا۔ یہ تو میں نے خواب دیکھا ہے۔ کیا خواب سچے ہوتے ہیں؟ سچے نہیں ہوتے تو کیا فیروزہ نے اپنے بارے میں سچ کہا ہے؟ کیا اُس کی خوش قدمی کے باعث میرے نصیب جاگ گئے ہیں؟

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے اندر اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے سرہانے سے سگریٹ کا پیکٹ لے کر اس میں سے ایک سگریٹ سلگایا۔ پھر گہرے گہرے کش لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ "خواب خواہ سچے ہوں یا نہ ہوں' عورت سچ بولے یا جھوٹ لیکن جہاں لاکھوں روپے کی آمدنی کی بات آتی ہے' وہاں انسان ذرا ضعیف الاعتقاد ہو جاتا ہے۔ میرا دل' میرا دماغ کہہ رہا تھا' آج فیروزہ آئی ہے اور اُس کے آنے سے میرے نصیب جاگ گئے ہیں۔ اگر یہ سچ نہ بھی ہو تو مجھے فیروزہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ آزمانا چاہیے کہ نصیب کب تک بنتے رہیں گے۔

میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ ساس آخر ساس ہوتی ہے دوسرے دن بیگم شائستہ مرزا نے پھر وہی رویہ اختیار کیا۔ فیروزہ کے آتے ہی اپنی نظروں کا پہرہ بٹھا دیا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پچھلی رات کے خواب کا کوئی تاثر اس کے چہرے پر بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ یہ میری حماقت تھی مگر اُسے دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ میں ایک غریب اور گھٹیا زندگی گزارنے والی کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں دینا چاہتا تھا مگر حالات اُس کی طرف مائل کر رہے تھے وہ میرے لیے سات سُروں سے بجی ہوئی ایک موسیقی تھی۔ ہم موسیقی کو اُس کی گہرائی تک نہیں سمجھتے مگر اُسے سُنتے ہی اُس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ موسیقی کیوں اچھی لگتی ہے' ہم اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ میں فیروزہ کی طرف مائل ہونے والی بے خودی کی وضاحت نہیں کر سکتا۔

وہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق صبح آٹھ بجے آئی تھی۔ میں نو بجے گھر سے نکل گیا۔ مجھے

کنور آفتاب خلجی سے نئے ٹھیکوں کے سلسلے میں تحریری معاہدہ بھی کرنا تھا اور پیشگی رقم بھی لینا تھی۔ خلجی صاحب مجھ پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ میں بھی اُن کے اعتماد کو کبھی ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اُنھوں نے دوپہر تک مجھے ایک لاکھ روپے پیشگی کے طور پر دیئے۔ اُسی وقت سے کام شروع ہوگیا۔ میں شام کے سات بجے تک کاریگروں‘ مزدوروں کو حاصل کرنے کے لیے اخبارات میں اشتہارات دینے اور دلالوں سے رابطہ قائم کرنے میں مصروف رہا۔ ٹھیک سات بجے دفتر سے اُٹھ گیا۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ فیروزہ آٹھ بجے ہماری کوٹھی سے نکل کر اپنے گھر جانے کے لیے اس بس اسٹاپ پر آتی ہے۔ میں اسی جگہ اس سے آزادی سے ملاقات کر سکتا ہوں۔

میں آٹھ بج کر بیس منٹ پر بس اسٹاپ پر پہنچ گیا مگر وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ ہو سکتا تھا‘ وہ وقت سے پہلے چلی گئی ہو جس کی اُمید نہیں تھی۔ میری ساس پورا کام لیے بغیر اُسے چھٹی دینے والی نہیں تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ ہیڈلائٹس کی روشنی میں نظر آئی۔ سڑک کے کنارے سر جھکائے چلی آرہی تھی۔ میں نے اُس کے قریب گاڑی روک دی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ میں یوں اچانک اُس کے راستے میں آجاؤں گا۔

میں نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”آؤ بیٹھ جاؤ۔“

”آپ مجھے کار میں بیٹھنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ آسمان اور زمین کے فرق کو مٹانا چاہتے ہیں؟“

”ایک آدمی تو نہیں مٹا سکتا مگر یہ کوئی بڑا کام بھی نہیں ہے۔ کوئی ساتھ دے تو اس فرق کو ختم کیا جا سکتا ہے۔“

”صاحب جی! میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں‘ میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔ یہ آپ کے لیے محض دل لگی ہوگی مگر ہمارے پیٹ پر لات پڑے گی۔ ہم غریب بھوکے مرجائیں گے۔“



میں نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا جس سے تمھاری بدنامی ہو یا تمھاری روزی جاتی رہے۔ میں نے کل بھی کہا تھا‘ میں تمھارا تحفظ کروں گا۔“

”لیکن آپ ایسا کیوں کریں گے؟“

”ایسی باتیں یوں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نہیں کی جاتیں۔ تم مجھ پر اعتماد کرو اور گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں گھر تک پہنچا دوں گا۔“

”آپ چاہتے ہیں‘ میں اپنے محلے میں جا کر اتنی قیمتی گاڑی سے اُتروں اور پل بھر میں بدنام ہو جاؤں۔“

”میں تمھیں گھر کے قریبی بس اسٹاپ پر اُتار دوں گا۔ پلیز‘ بیٹھ جاؤ۔“

وہ چند لمحے تک مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اُس نے تنبیہہ کے انداز میں ایک انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے کہنے پر بیٹھ رہی ہوں لیکن یاد رکھیے گا اگر میری مرضی کے خلاف آپ مجھے کہیں لے جانا چاہیں گے تو میں دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دوں گی۔“

اُس نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دروازے کو بند کرلیا۔ میں نے بھی اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالی‘ کار کو اسٹارٹ کیا۔ پھر اُسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”صبح تم آئیں تو بار بار میری نظریں تمھاری طرف اُٹھ رہی تھیں۔ میں فوراً ہی گھر سے نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی اور ساس تمھیں ملازمت سے نکال دیں لیکن میں نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ‘ تمھاری واپسی پر بس اسٹاپ پر پہنچوں گا‘ وہاں تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔ میں اسی بس سٹاپ پر انتظار کرنے کے بعد اِدھر آرہا ہوں۔ شکر ہے کہ تم مل گئیں۔“

”آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں۔ میں اسے کیا سمجھوں؟“

”اب بھی سمجھنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے۔ تمھیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں۔“

”اوہ‘ خدا کے لیے چُپ ہو جائیے۔ ایسی بات زبان پر مت لائیے کہ مجھ جیسی لڑکی اُلجھن میں پڑ جائے اور پھر اس اُلجھن سے کبھی نہ نکل سکے۔ پلیز‘ آپ کو اللہ کا واسطہ۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ "کمال ہے! غریب جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خوا[ب] دیکھتے ہیں۔ ایک محل والا تمھاری طرف کھنچا آرہا ہے اور تم اُس سے کترا رہی ہو۔"

"بے شک آپ محل والے ہیں۔ کیا مجھ غریب کو محل والی بنانا پسند کریں گے؟"

"تم چاہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ کی بیوی موجود ہے۔"

"اُس کا نام نہ لو۔ میں اُن ماں بیٹی سے پیچھا چھڑانے کے لیے دن رات سوچتا ر[ہتا] ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ اُن سے کیوں پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں؟"

"آج اس کوٹھی میں تمھاری ملازمت کا دوسرا دن ہے۔ کیا اب تک تم نے میر[ی] بیوی اور ساس کو نہیں سمجھا ہے۔ تم تو عورت ہو' میرے کہنے سے پہلے تمھیں سمجھ لی[نا] چاہیے۔"

وہ تائید میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "بیگم صاحبہ کو آپ پر اعتماد نہیں ہے۔ جب مَیں پہلی بار نوکری کے لیے آئی تو انھوں نے میرے لباس کو دیکھ کر کہا تھا' ایسا چست لباس نہیں چلے گا' ڈھیلا پہننا ہوگا۔ میں نے کہا' میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں نئے لباس سلوا سکوں۔ اس پر اُنھوں نے مجھے ایک جوڑے کے لیے نقد پیسے دیئے۔ میں یہ کل سے پہن رہی ہوں......... توبہ' توبہ' وہ کیسی گندی باتیں سوچتی ہیں۔ مجھے تو سوچ کر شرم آتی ہے۔ اگر مجبور نہ ہوتی تو کبھی یہ ملازمت نہ کرتی۔"

"کیا تم اپنے ساتھ دوسرا لباس بھی لے کر آتی ہو؟"

"میں اپنے گھر سے اپنا لباس پہن کر آتی ہوں اور آپ کی ساس صاحبہ نے جو لباس میرے لیے سلوایا ہے' وہ میں کوٹھی میں پہنچ کر پہنتی ہوں۔ اس کے بعد چھٹی ہوتی ہے تو اپنا یہ لباس پہن کر آجاتی ہوں۔"

"میری ساس نے میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اب وہ تمھارے پیچھے بھی پڑ گئی ہے۔ تمھیں معلوم ہے کل میری بیوی کیا کہہ رہی تھی مجھ سے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"



"کہہ رہی تھی کہ وہ چونکہ میری خدمت کے قابل نہیں رہی' اس لیے میری دوسری شادی کرائے گی۔ اپنے ہاتھوں سے کسی کو دُلہن بنا کرلائے گی۔"

فیروزہ نے مجھے کن اکھیوں سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "اونہہ' آپ کا خیال ہے کہ وہ مجھ جیسی غریب کو اپنی سوکن بنائیں گی۔"

"نہ وہ بنائے گی' نہ میں دونوں کے ساتھ زندگی گزرا سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں' کسی طرح اس سے پیچھا چھوٹ جائے۔"

فیروزہ ایک گہری سانس لے کر گئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تم نہیں چاہتیں کہ مجھے عذاب سے نجات ملے اور تمھارے ساتھ ایک بہت ہی پُرمسرت زندگی گزاروں؟"

"میں مسرت بھری زندگی کے خواب دیکھتی ہوں اور ایسے خواب دیکھنا ہر لڑکی کا حق ہے لیکن میں کسی کی بُرائی نہیں چاہتی میں اپنی زبان سے یہ نہیں کہوں گی کہ آپ اپنی بیوی کو طلاق دیں یا اُسے کسی بھی بہانے اپنی زندگی سے نکال دیں۔"

"تم زبان سے نہ کہو مگر دل سے تو کہہ سکتی ہو۔ اگر میں اپنی محبت کا یقین دلاؤں تو تم مجھ سے ہمدردی کر سکتی ہو۔ میری طرح سوچ سکتی ہو اور اس کانٹے کو نکال پھینکنے میں میری کچھ مدد کر سکتی ہو۔"

اس نے بڑی بڑی' حیران حیران آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں کیا چاہتا ہوں' یہ اُس وقت بتاؤں گا' جب میری چاہت کو اچھی طرح سمجھنے لگوگی۔ یہ بتاؤ' تم کہاں رہتی ہو؟"

"پاکستان کوارٹرز۔ آپ مجھے گارڈن کے اسٹاپ پر چھوڑ دیں۔"

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ میں آہستہ آہستہ ڈرائیو کر رہا تھا تاکہ زیادہ دیر اس کا ساتھ رہے اور میں کسی طرح اُسے قائل کرلوں ......... آخر میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ "اپنے متعلق بتاؤ۔ تمھارے والد بیمار ہیں۔ دوسرے بہن بھائی ہیں یا نہیں۔ وہ بھی تو کچھ کرتے ہوں گے۔"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک بوڑھے والد ہیں۔"

"اور والدہ؟"

"اس کا ذکر نہ کریں۔"

"ارے تم تو نفرت سے کہہ رہی ہو۔ کیا اپنی والدہ سے محبت نہیں ہے؟"

"میں ماں کے مقدس رشتے اور اُس کی ممتا سے انکار نہیں کرتی مگر میری بدنصیبی یہ ہے کہ مجھے ایسی ماں نصیب ہوئی جو بارہ برس کی عمر میں مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟"

"ایک رات وہ میرے والد کو چھوڑ کر چلی گئی۔ صبح ہم پریشان ہوگئے۔ میرے ابو کو اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تمام دن میری ماں کو تلاش کرتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ مل جائیں گی تو سمجھا بجھا کر لے آئیں گے تاکہ محلے پڑوس والے باتیں نہ بنائیں۔ وہ بدنامی سے پہلے ہی بدنام کرنے والی کو گھر واپس لانا چاہتے تھے لیکن کہیں پتا نہیں چلا۔ پھر یہ بات پھیلتی چلی گئی اور میرے اُبو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم نے وہ محلہ چھوڑ دیا اور پاکستان کوارٹرز کے پاس آکر رہنے لگے۔ ایک برس کے بعد پتا چلا' میری ماں کسی دوسرے شخص کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میرے ابّو کے ایک دوست نے بتایا کہ امی نے اس شخص سے شادی کرلی ہے۔ میں یہ سُن کر شرم سے گڑ گئی۔"

"تمہیں ماں سے نفرت ہوگئی ہے؟"

"اتنی کہ بیان نہیں کرسکتی۔ چار برس بعد وہ مجھ سے ملنے آئی تھیں مگر میں نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "خون کے رشتے ٹوٹتے نہیں۔ آپس میں کتنے ہی لڑیں جھگڑیں' ایک دوسرے سے کتنی ہی شدید نفرت کریں لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک ہوجاتے ہیں۔"

"میری زندگی میں وہ موڑ کبھی نہیں آئے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ کسی مصلحت کے تحـ [illegible]ی مجبوری کے باعث اُن سے ملنا ضروری ہوگیا تو؟"



"تو میں ان کی صورت دیکھنے سے پہلے مرجاؤں گی۔"

"اس کا فائدہ کیا ہوگا؟"

"یہی کہ دنیا والے بیٹی کو غیرت مند تسلیم کرلیں گے' ورنہ ان کی وجہ سے لوگ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ماں اپنے شوہر کو چھوڑ کر بھاگ گئی' بیٹی بھی ایسا کرسکتی ہے۔ میں دنیا والوں کے ایسا کہنے سے پہلے ہی جان دے دوں گی۔"

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا' اگر اس کا رنگ صاف ہوتا' تو یہ ایک حسین ترین لڑکی ہوتی اور میں اس لیے بھی اسے اپنی شریکِ حیات بنالیتا کہ اس کے ساتھ میری کوئی ساس کبھی نہیں آئے گی۔ یہ تو خود اپنی ماں سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اس کی صورت دیکھنے سے پہلے ہی مرجانا چاہتی ہے' بس مجھے ایسی ہی شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔ کاش یہ کالی نہ ہوتی۔

میرے دل نے کہا' کالی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس میں گُن کتنے ہیں' کتنی وفادار' غیرت مند اور اپنی عزت کا تحفظ کرنے والی لڑکی ہے۔ سراپا ناز ہے' سراپا بہار ہے۔ ناک نقشے میں کوئی نقص نہیں ہے۔ پھر کالی ہونے سے کیا ہوتا ہے؟

آہستہ آہستہ ڈرائیو کرنے کے باوجود ہم گارڈن کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے ایک بس اسٹاپ پر کار کو روکتے ہوئے کہا۔ "کل رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔ "تعجب ہے' خواب میں دیکھ کر بھی نہیں ڈرے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ کوئی جواب سُنے بغیر تیزی سے قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ میں اُسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کیسی سرو قد تھی۔ چلتے ہوئے پھولوں بھری شاخ کی طرح لچکتی جارہی تھی۔ کاش کہ پھول کالے نہ ہوتے۔

میں وہاں سے واپس آگیا۔ بعض حالات میں ایک معمولی چیز ہماری اہم ترین ضرورت بن جاتی ہے اور ایک اعلیٰ ترین شے ہمارے کسی کام نہیں آتی۔ میری شریکِ حیات میرے کسی کام کی نہیں تھی اور یہ کالی بلا میری اہم ترین ضرورت تھی۔ اس میں کچھ عجیب سی کشش تھی' ایک طرح کی پسندیدگی تھی۔ میرا دل' میرا دماغ کہتا تھا' میں

فیروزہ کی آنکھوں کو' اس کے چہرے کے نقوش کو' اس کے سراپا' اُس کی اداؤں کو جس حد تک پسند کرنے لگا ہوں' وہاں تک کوئی دوسری عورت نہیں پہنچ سکتی۔

وہ کالی تھی مگر ایک حسین بلا تھی جو مجھے اپنی نادیدہ گرفت میں لیتی جارہی تھی۔ پہلے پہل چاٹ اور دہی بڑے فٹ پاتھ پر بکنے والی چیزیں تھیں۔ نچلے طبقے کی عورتیں اور مرد فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر کھاتے تھے۔ اونچے طبقے کے لیے یہ بڑا پرابلم تھا۔ وہ فٹ پاتھ والوں کے ساتھ کھڑے ہو کر نہیں کھاسکتے تھے۔ لہٰذا فیشن کے طور پر کار میں آکر شاہانہ انداز میں آرڈر دے کر کار ہی میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ چاٹ اونچے درجے کے ریستورانوں کے مینو میں شامل ہوگئی۔ ہم بڑے لوگ کسی گھٹیا چیز کو اوّل تو منہ نہیں لگاتے لیکن وہ ہماری ضرورت بن جائے تو اُسے پالش کر کے اپنے معیار کے مطابق بنا کر اپنی سطح تک لے آتے ہیں۔ میں فیروزہ کو بھی اُونچی سوسائٹی میں لاسکتا تھا لیکن کوشش یہی تھی کہ فٹ پاتھ کی چیز فٹ پاتھ پر ہی مل جائے۔

اس رات گھر پہنچا تو میری بیوی اور ساس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ بیوی تو بے چاری کم بولتی تھی۔ ساس اُس کی کمی پوری کر دیتی تھی۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "روزانہ اتنی رات کو آنے لگے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

میں نے دونوں ماں بیٹی کو گھور کر دیکھا پھر اپنا بریف کیس واجدہ کے قریب رکھ کر کھول دیا۔ اس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی دونوں کو چپ لگ گئی۔ میں نے کہا۔ "یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے آدمی گھر سے باہر رہتا ہے۔ آئندہ تم میں سے کسی نے دیر سے آنے کی شکایت کی یا میری مصروفیات کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

میں نے بریف کیس کو بند کیا۔ پھر اُسے لے کر اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ پتا نہیں' فیروزہ کس طرح چپکے سے سحر پھونک رہی تھی۔ اب میں جب بھی واجدہ کا سامنا کرتا تو وہ میری نگاہوں کے سامنے چلی آتی۔ اگر میں فیروزہ کو نوٹوں کی وہ گڈیاں دکھاتا تو وہ نوٹوں کو بھی دیکھتی اور مجھے بھی دیکھتی' لیکن جب میں نے واجدہ کے سامنے بریف کیس کھولا تو بریف کیس بستر کے سرے پر رکھا ہوا تھا' اور وہ دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ



نوٹوں کو دیکھ رہی ہے یا نیچے پڑے ہوئے چپل کو۔ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ ابھی چپل اٹھائے گی اور میرے سر پر مار کر روپے چھین لے گی۔

یوں دیکھا جائے تو وہ ہر روز مجھ سے میری آمدنی چھینتی رہتی تھی۔ کوئی نہ کوئی ضرورت پیش کر کے مجھ سے چھوٹی بڑی رقمیں وصول کرتی رہتی تھی۔ جب میں بیڈ روم میں آیا تو میرے پیچھے ساس صاحبہ بھی پہنچ گئیں۔ اُنھوں نے کہا۔

"بیٹے! واجدہ کے تمام زیورات پرانے ہو چکے ہیں۔ وہ لیٹسٹ ڈیزائن کے دو سیٹ خریدنا چاہتی ہے۔"

میں نے غصے سے پوچھا۔ "میری بیوی واجدہ ہے یا تم ہو؟"

وہ ایک دم سے بگڑ کر بولیں۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"بکواس تو تم کرتی ہو۔ بیوی اپنے شوہر کے پاس آکر محبت سے اپنی ضرورت پیش کرتی ہے۔ تم کس رشتے سے میرے پاس آئی ہو؟"

"میں نہیں آتی تو کیا کرتی۔ تم نے روپوں کی ایک جھلک دکھائی اور یہاں چلے آئے۔ وہ بے چاری نیچے نہیں آسکتی' مجھے ہی آنا پڑا۔ ایسا کرو کھانے کے بعد اوپر واجدہ کے پاس چلے جانا۔ وہ تم سے اور بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہے۔"

"یعنی دو عدد سیٹ کے علاوہ اور بھی ضروری شاپنگ وغیرہ کی فہرست تیار ہو چکی ہوگی۔ تاکہ کل صبح یہ ایک لاکھ روپے ختم ہو جائیں۔"

"تم تو ہمیشہ جھگڑا بڑھانے والی باتیں کرتے ہو۔ چلو یہ تمھارا اور واجدہ کا معاملہ ہے۔ میں اپنے معاملے میں ایک مشورہ لینا چاہتی ہوں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "آپ اور مجھ سے مشورہ لیں گی؟ بھلا کس معاملے میں؟"

"وہ ہماری کوٹھی ہے' وہاں واجدہ کے اُبو اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں' کوٹھی فروخت کردوں اور اس کے اُبو کو یہاں لے آؤں۔"

"میری اتنی بڑی کوٹھی کے ہر حصے پر آپ کا قبضہ ہے۔ آپ کے شوہر نامدار کی گنجائش کہاں ہوگی؟"

"اے بیٹا! مذاق نہ کرو۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔"

"میں بھی سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں۔ وہ کوٹھی فروخت نہ کریں۔ اپنے بُرے وقت میں سرچھپانے کے لیے رہنے دیں۔"

"بُرا وقت؟ کیسا بُرا وقت؟"

"یہی کہ میں سال بھر میں ساٹھ ستر لاکھ روپے ضرور کمالوں گا جس میں سے بیس لاکھ روپے تمہاری بیٹی کے منہ پر ماروں گا اور تم سب سے نجات حاصل کرلوں گا۔"

وہ ایک دم سے بھڑک کر بولیں۔ "تم میری بیٹی کو طلاق دوگے۔ میں تمہارا جینا دشوار کردوں گی۔ اُونچی سوسائٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ عدالت تک گھسیٹ کرلے جاؤں گی۔ میں حقوقِ نسواں کی علمبردار ہوں۔ ملک کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک تمام خواتین میرا ساتھ دیں گی اور تمہارے خلاف محاذ قائم کریں گی۔ تمھیں فرار کا راستہ نہیں ملے گا۔"

"میں تمہاری دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہوں۔ میری شریکِ حیات دونوں پاؤں سے اپاہج ہے۔ مجھے یہ قانونی حق حاصل ہے کہ دوسری شادی کروں۔ تمہاری دھمکیاں سُن کر یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ واجدہ کو طلاق دینا حماقت ہوگی۔ خواہ مخواہ لوگ مجھے ظالم کہیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ طلاق دی جائے۔ وہ ایک کمرے میں پڑی ہے' پڑی رہے گی۔ میرے لیے دوسری آجائے گی۔ میں دیکھوں گا کہ تم مجھے دوسری شادی کرنے سے کیسے روکتی ہو۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "نہ تم اُسے طلاق دو سکو گے نہ اس پر سوکن لاسکو گے۔ میرا نام شائستہ بیگم ہے' ذرا دیکھتے جاؤ بچُو کہ اب میں کیا کرتی ہوں۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ڈرائنگ روم سے اس کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چیخ چیخ کر بات کر رہی تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو وہ ریسیور کان سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ "میں کہتی ہوں' یہ بالکل ہنگامی اجلاس ہوگا۔ میں فون کے ذریعے وی' آئی' پی خواتین سے رابطہ قائم کر رہی ہوں' تم بھی کرتی جاؤ' مگر پہلے ہوٹل انٹر کان کے بنکویٹ ہال کو ریزرو کرالو۔ میری طرف سے کل لنچ پارٹی ہے۔"



وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی باتیں سننے لگیں۔ پھر انکار میں سرہلا کر بولیں۔

"نہیں نہیں' ایجنڈے میں کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔ صرف میری بیٹی کا مسئلہ پیش کیا جائے گا۔ اُس کا مستقبل خطرے میں ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر تم سے رابطہ قائم کروں گی۔ تم مجھے تفصیل سے بتانا کہ کُل کتنی.......... ویری امپورٹنٹ لیڈیز کو کل کے اجلاس میں مدعو کیا ہے؟"

یہ کہہ کر بیگم شائستہ مرزا نے کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر دوسرے نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ میں چپ چاپ دروازے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے مختلف نمبر ڈائل کرتی تھیں اور باری باری اُن خواتین سے رابطہ قائم کرتی جاتی تھیں جو کسی نہ کسی طور مشہور تھیں۔ ان میں سے کوئی دولت میں بڑھ چڑھ کر تھی' کوئی اثرورسوخ میں' کسی کی ابرو کی ایک جنبش سے اسٹیل مل کا ٹھیکہ میرے ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو غریب نہیں ہوتے اور امیر ہو کر بھی امیر نہیں ہوتے۔ افراطِ زر کے باعث ہمارے ملک میں اتنے کروڑ پتی اور ارب پتی لوگ ہیں کہ اُن کے سامنے ہم چند لاکھ روپے کمانے والے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اُن کی نظروں میں ہم ایسے ہی ہیں جیسے ہماری نظروں میں مزدور ہوتے ہیں۔ جو آج کماتے ہیں' اور آج ہی اپنی امارت قائم رکھتے ہیں۔ کل کے لیے ہمارا کوئی تحفظ نہیں ہے۔ بھلا ایسی بھی کیا دولتمندی جن کا بینک بیلنس بیرونی ممالک میں نہ ہو' جو اپنے ملک کی غریب کرنسی کو مہنگے زرِ مبادلہ میں تبدیل کرنا نہ جانتا ہو۔ میں ایسے امیرو کبیر لوگوں میں سانس لے رہا تھا جو اپنی دولت کے بل پر ملک کا قانون بدلنے پر قدرت رکھتے تھے۔ بیگم شائستہ مرزا ویری امپورٹنٹ لیڈیز کے ذریعے مجھے میری کوٹھی سے نکال کر فٹ پاتھ پر پھینک سکتی تھیں۔

انھوں نے پندرہ اہم خواتین کو ٹیلیفون کے ذریعے کل کے اجلاس کے متعلق اطلاع دی تھی اور اُنھیں لنچ پارٹی میں شریک ہونے کے لیے کہا تھا۔ وہ مزید نمبر ڈائل کر کے ابھی یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہتی تھیں' اچانک مجھ پر نظر پڑی تو ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔

میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ "میں تمہاری دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ میں دیکھوں

گا کہ تم عورتیں میرا کیا بگاڑ لوگی۔"

"عورتیں نہ کہو' صرف ایک عورت۔" انھوں نے اپنے سینے پر انگلی رکھے ہو۔ کہا۔ "ذرا کل انکم ٹیکس کا دفتر کھلنے دو۔ اس دفتر کے مُردہ خانے میں تمھاری فائل پڑ ہے۔ میں اس فائل کو بھی زندہ کردوں گی۔"

وہ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ میں ہکا بکا سا اپنی خوشدامن صاحبہ کا م تکنے لگا۔ جب مات ہو رہی ہو تو سب سے پہلے مصلحت اندیشی کی بات دماغ میں آتی ہے میں نے سوچا۔ "واجدہ کو طلاق نہیں دے سکوں گا۔ یہ بڑی بی واقعی اعلیٰ طبقے میں میرا ج محال کردیں گی۔ یوں بھی طلاق دینا اور بیس لاکھ روپے ضائع کرنا حماقت ہوتی۔ کیا ہرج ؟ اگر وہ بیوی ایک جگہ پڑی ہوئی تھی؟"

یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی کہ جو فائل دبا کر رکھی گئی ہے' وہ پھر افسرا کے سامنے پیش کی جاسکتی ہے۔ اس طرح پندرہ لاکھ سے کچھ زیادہ ہی نقصان میں پڑ جاتا۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جھگڑا اس حد تک بڑھانا نہیں چاہتا کہ میری وج سے آپ لوگوں کو نقصان پہنچے اور آپ کی وجہ سے میں نقصان اٹھانے پر مجبور ہوجاؤں۔"

اُنھوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے' ہوش ٹھکانے آرہے ہیں۔"

"محترمہ خوشدامن صاحبہ! مجھے چیلنج نہ کرو۔ مرد کو للکارا جاتا ہے تو وہ ہزار نقصان برداشت کرکے بھی انتقام ضرور لیتا ہے۔"

اُنھوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔

"میں للکارنا نہیں چاہتی اپنی بیٹی کا تحفظ چاہتی ہوں۔ تم جیسے داماد اپنی ساس کو بُرا کیوں کہتے ہیں؟ محض اس لیے کہ ساس اپنی بیٹی کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔"

"اچھی بات ہے' تمھاری بیٹی کو میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں اُسے کبھی طلاق دینے کے متعلق نہیں سوچوں گا۔"

"صرف طلاق کی بات نہیں ہے۔ تم اُس پر کوئی سوکن بھی نہیں لاؤ گے۔"

"تم اس کے لیے مجبور نہیں کرسکتیں۔ دوسری شادی میری ضرورت ہے۔"



"تمھاری ضرورت تم سمجھو' میری ضرورت میں سمجھتی ہوں۔ میری بیٹی پر سوکن نہیں آنا چاہیے۔ جس دن آئے گی' اُس دن سے پہلے ہی انکم ٹیکس والے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تمھارے جو ٹھیکے چل رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوجائیں گے۔ تمھارے جیسے نودولتیے چٹکیوں میں مسل دیئے جاتے ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی پھر شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھاری بیٹی پر سوکن نہیں لاؤں گا۔ خدا کے لیے جھگڑا ختم کرو مجھے ذہنی انتشار میں مبتلا مت کرو۔"

میں اپنے بیڈروم میں آگیا اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ مجھے غصہ آرہا تھا جی چاہتا تھا' ابھی اپنی ساس کا گلا دبا دوں۔ ساس نے آکر محبت سے پوچھا۔ "بیٹا! کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

میں ٹھنڈا پڑگیا۔ پھر میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ پلیز' لائٹ آف کردیجیے۔"

وہ بتی بجھا کر چلی گئیں۔ میں اندھیرے میں دانت کچکچانے لگا۔ واجدہ نے مجھے کیا سکھ دیا تھا۔ جب سے آئی تھی مصیبت بنی ہوئی تھی اور میری تباہی کا سبب بھی وہی تھی۔ اس کے آتے ہی مجھے بیس لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ پندرہ لاکھ اب تک انکم ٹیکس کے ادا نہیں کیے گئے تھے۔ صرف فائل دبا دی گئی تھی۔ باقی پانچ لاکھ روپے آج تک نہ مل سکے ور نہ ہی ملنے کی توقع تھی۔ اس پر سے ایک بھینگی عورت پلّے پڑی تھی۔ پہلے بھینگی تھی پھر دونوں پاؤں سے اپاہج ہوگئی۔ صرف اتنا ہی نہیں' اپنی ماں کو بھی لاکر میرے سر پر مسلط کر دیا تھا۔ ایک گوری عورت سے مجھے کیا مل رہا تھا؟ کچھ نہیں۔ میری زندگی میں جو کمی تی' اسے گوری نہیں کالی پوری کرسکتی تھی۔ اگرچہ میں نے اسے اچھی طرح پرکھا نہیں ما۔ جتنی ملاقات کی تھی اس سے اندازہ ہوگیا تھا کہ فیروزہ کا دل محبت سے لبریز ہے۔ وہ ک وفادار بیوی بن سکتی ہے۔ وفادار بھی اور احسان مند بھی۔ اگر میں اُسے ذرّے سے فتاب بناؤں گا تو وہ تمام عمر میرے قدموں میں پڑی رہے گی۔

میرے دماغ میں میری ساس ایک چڑیل کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے آئی اور پوچھنے ما۔ "تم میری بیٹی کے ہوتے ہوئے کسی کو ذرّے سے آفتاب کیسے بنا سکو گے؟"

میرے دماغ میں مختلف قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ کبھی ساس آ رہی تھی، کبھی بیوی اور کبھی فیروزہ۔ میں نے فوراً ہی اُٹھ کر دو خواب آور گولیاں نکالیں اور اُنھیں نگل کر پانی پی لیا۔ اس کے بعد بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے دن بہت مصروف رہا۔ مصروفیت کے باوجود یہ یاد رہا کہ فیروزہ سے ملاقات کرنا ہے۔ سات بجتے ہی میں اپنی کار لے کر تیزی سے دوڑاتا ہوا اسی بس سٹاپ کے پاس پہنچا۔ ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ وہ اتنی جلدی نہیں آسکتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا اسی اسٹریٹ میں داخل ہو گیا جس کے آخری سرے پر میری کوٹھی تھی۔ وہ اسی راستے سے آتی جاتی تھی۔ سست رفتاری سے ڈرائیو کرنے کے باوجود وہ دور تک نظر نہیں آئی۔ میری کوٹھی قریب آ رہی تھی۔ میں نے ایسی جگہ گاڑی روک دی جہاں سے کوٹھی کے مین گیٹ پر نظر رکھ سکوں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ مین گیٹ سے نکلی۔ میں نے گاڑی کو موڑ کر اُس کا رُخ دوسری طرف کر دیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ اسٹریٹ لیمپ روشن تھے۔ اس لیے وہ دور سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے عقب نما آئینے کو اس طرح رکھا کہ وہ نظر آتی رہے۔ جب وہ اوجھل ہوتی تو میں آئینے کو پھر اُس کی طرف کر دیتا حتیٰ کہ وہ کار کے قریب آتے ہی ٹھٹک گئی۔ اس نے گاڑی پہچان لی تھی۔ میں انجان بنا سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ جب عقب نما آئینے میں وہ قریب آتی ہوئی دکھائی دی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی کار کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر مجھے اُس کی خوشبو آئی۔ میں نے حیرانی سے سوچا۔ یہ صرف پچھلی رات میری گاڑی میں بیٹھی تھی اور اپنے گھر تک گئی تھی۔ کیا میں نے اتنی مختصر سی ملاقات میں اس کی کسی ایسی خاصیت کو پہچان لیا ہے کہ آنکھ بند کر لینے کے باوجود معلوم کر لیتا ہوں کہ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی ہے۔

مجھے یاد آیا، پچھلی رات اُس نے کار میں بیٹھتے ہی اپنی کُھلی ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا تھا۔ زلفوں کے سائے میں گردن پر پسینہ چمک رہا تھا۔ کار کی کھڑکی سے آنے والے ہوا کے جھونکے نے اس پسینے کی مہک میرے نتھنوں تک پہنچائی تھی۔ اُسے خوشبو تو نہیں کہتے، لیکن وہ عجب بے خود کر دینے والی مہک تھی۔



میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی کھلی ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا بنا رہی تھی۔ اس کی گردن پر پسینہ چمک رہا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے اس پسینے کا رابطہ میری حسِ شامہ سے قائم کر رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا، تمھیں آج بھی گاڑی میں بٹھانے کے لیے خوشامد کرنا پڑے گی۔"

"میں مردوں سے خوشامد کرانے میں فخر محسوس نہیں کرتی۔ آج بھی اس گاڑی کو دیکھ کر یقین ہو گیا کہ آپ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ لہٰذا خود ہی آکر بیٹھ گئی۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایسی ہی عورت چاہتا ہوں جو خود ہی میری باتوں اور میرے جذبوں کو سمجھ لیا کرے۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا آپ میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے؟"

"ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔ چاہے تمھارا پیچھا کرتے ہوئے دُنیا کے آخری سرے تک کیوں نہ جانا پڑے، تم مجھے کبھی تھکا ہوا نہیں پاؤ گی۔"

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟"

میں نے فوراً ہی سوچ کر کہا.......... "سچی محبت شادی کی محتاج نہیں ہوتی۔ میں یہاں کے کسی اچھے علاقے میں ایک اچھا سا فلیٹ خرید کر تمھیں دے دوں گا۔ ماہانہ دو ہزار روپے بھی اخراجات کے لیے دیتا رہوں گا۔"

"اور میں اتنی بڑی دنیا سے ناتا توڑ کر اس فلیٹ کی چار دیواری میں محدود ہو جاؤں گی۔ میری کوئی سوسائٹی نہیں ہو گی، میری کوئی عزت نہیں ہو گی۔ کوئی مجھے شوہر والی نہیں کہے گا کیونکہ میرا شوہر دنیا والوں سے چھپ کر اس فلیٹ میں آیا کرے گا۔ کیا آپ کو ذرا بھی احساس ہے کہ آپ نے مجھے کتنی بڑی گالی دی ہے؟ آپ مہربانی کر کے گاڑی روکیے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"تم تو ناراض ہو گئیں۔ بھئی اتنی جلدی کسی بات پر غصے نہیں ہو جانا چاہیے۔ اگر میں ایک بات کہتا ہوں تو مجھے اس کا معقول جواب دو اور قائل کرو۔"

"بڑے آدمیوں کے لیے یہ بات معقول ہے لیکن ہم غریبوں کے لیے اس سے بڑی گالی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ غصہ نہ کرو' ٹھنڈے دماغ سے بات کرو تاکہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

"جب ہم اخلاق اور تہذیب کے تقاضے پورے کریں گے تو خود بخود اچھے نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"

میں تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ ڈرائیو کرتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرح اُسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہوں۔ اس کے مزاج سے پتا چل گیا تھا' وہ سستی نہیں تھی.......... میں نے سوچا' پہلے اُسے اور زیادہ محبت کے فریب میں لانا چاہیے۔ اپنی محبت کا زیادہ سے زیادہ سِکّہ بٹھانا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "کل تم سے اپنے خواب والی بات کہی تھی اور تم نے اُسے مذاق ڈال دیا تھا۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ پرسوں رات میں نے تمھیں خواب میں دیکھا تھا۔"

"میں بھی خواب دیکھتی ہوں۔"

"میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "سچ؟"

"ہاں' جب اپنی زندگی میں شیش محل نہیں بنا سکتی تو خوابوں میں بناتی ہوں۔ ایسا ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ مجھے حاصل نہیں کر سکتے' اس لیے خوابوں میں پالیتے ہیں۔"

"تم میرے لیے لکی ہو۔ پرسوں تم سے پہلی ملاقات ہوئی اور پرسوں ہی مجھے کئی لاکھ روپے کا ٹھیکہ مل گیا۔"

"کیا میرے ملنے سے ٹھیکہ ملا ہے؟"

"بیشک' یہی بات ہے۔ پرسوں خواب میں تم نے آکر یہی کہا تھا کہ تم خوش قدم ہو' میری زندگی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھتے ہی لکھ پتی بن رہا ہوں۔"

"تعجب ہے' میری خوش قدمی نے مجھے ایک روپے کا نوٹ بھی نہیں دیا اور آپ کو



لکھ پتی بنا دیا۔"

"اسے مذاق نہ سمجھو۔ اگرچہ ان باتوں کو نہیں مانتا لیکن آدمی اپنی فطرت میں تھوڑا بہت ضعیف الاعتقاد ضرور ہوتا ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ تمھارے آنے سے میرے نصیب جاگ رہے ہیں۔ تم چلی جاؤ گی' تو میں پھر بدنصیب بن جاؤں گا۔"

"میں یہ ثابت کر سکتی ہوں کہ میں خوش قدم نہیں ہوں۔"

"کیسے ثابت کرو گی؟"

"آپ مجھ سے دور ہو جائیں۔ میں آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔ چپ چاپ آپ کے ہاں نوکری کروں گی اور اکیلی اپنے گھر جایا کروں گی۔ آپ مجھے چھوڑنے نہیں جائیں گے پھر دیکھیے کہ آپ کے نصیب جاگتے ہیں یا سوتے ہیں۔"

"میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ ایسا احمق کون ہوگا کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کو یہ آزمانے کے لیے تجوری میں کھلا چھوڑ دے گا کہ وہ روپے چوری ہوتے ہیں یا نہیں۔ جب تم میری خوش بختی بن کر آئی ہو تو میں خواہ مخواہ کیوں آزماؤں۔ آج تم دور ہو جاؤ گی' کل میرے ہاتھ سے لاکھوں کی رقم نکل جائے تو میں پچھتاتا رہ جاؤں گا۔ رقم واپس نہیں آئے گی' تمھیں تو کسی طرح سمجھا بجھا کر لے آؤں گا۔"

"تمھارے عقیدے کے مطابق میں واپس آؤں گی تو خوش بختی بھی واپس آئے گی۔"

"نہیں نہیں' میں تمھارے خیال سے باز نہیں آ سکتا۔"

"پھر ایک ہی راستہ ہے۔ پہلے آپ مجھ سے شادی کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔"

انہی باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ ہم پھر گارڈن کے قریب رک گئے۔ گاڑی کے رکتے ہی اس نے کوئی دوسری بات نہیں کی' فوراً ہی دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس نے تو آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ میں گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک تو کالی ہے اوپر سے نخرے کرتی ہے۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔ سوچتی ہوگی' ایک دولت مند پیچھے پڑا ہے تو اور بھی ہزار دولت مند پیچھے آئیں گے اونہہ' کوئی

اس پر تھوکے گا بھی نہیں۔

آخ تھو۔ میں نے کھڑکی کے باہر تھوک دیا۔ باہر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

"ذلیل کمینے! بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر غریبوں پر تھوکتے ہیں۔"

گاڑی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ میں اس سے آگے کچھ نہ سن سکا لیکن وہ ابھی تک سنا رہا ہوگا خواہ میں سنوں یا نہ سنوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے فیروزہ سنے یا نہ سنے۔ میں ناکامی کے باوجود اسے سناتا رہتا تھا۔

دوسرے دن میں نے فیصلہ کر لیا' اس کے غرور کا سر نیچا کروں گا' اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ وہ صبح آٹھ بجے آئی' میرا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ میں خواہ مخواہ اپنی بیوی اور ساس پر بگڑ رہا تھا۔ میں نے فیروزہ کو بھی قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر دفتر چلا آیا۔ وہاں پہنچتے ہی فون کے ذریعے اطلاع ملی' سائیٹ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ مجھے فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔

میں نے پھر کار کی اسٹیئرنگ سنبھالی اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا پیری مل پہنچ گیا۔ پتا چلا' پچھلے دن جو مشین میری تحویل میں دی گئی تھی اور اسے ایک جگہ نصب کیا جا رہا تھا' اس مشین کا ایک اہم پرزہ چوری ہوگیا ہے۔ کنور آفتاب خلجی نے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم تو آدمی ٹھوک بجا کر لاتے ہو۔ پھر ان میں چور کیسے آگئے؟"

"جناب! میں نے تو اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے اب ان میں سے کوئی چور نکل آئے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم کچھ نہیں کر سکتے لیکن یہ بات لیک آؤٹ ہو گی تو میرے ریکارڈ پر دھبہ لگ جائے گا میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔ چور اور چوری کا مال دونوں تلاش کر لو' اس وقت تک میں یہ بات چھپائے رکھوں گا۔"

میں نے حاضری کا رجسٹر کھول کر دیکھا۔ اس روز ایک کاریگر' ایک الیکٹریشن اور دو مزدور غیر حاضر تھے۔ میں نے ان کے نام پتے لیے' ایک آدمی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا پھر ان کی تلاش میں چل پڑا۔ ان میں سے دو پتے اتنے پیچیدہ تھے کہ انہیں تلاش کرتے کرتے دوپہر ہوگئی۔ بہرحال میں نے انہیں مکان سے باہر بلایا اور چوری کے متعلق بتایا۔ انہوں نے اپنی بے گناہی کے سلسلے میں قسمیں کھائیں۔ میں نے کہا۔ "قسمیں کھانے



سے کچھ نہیں ہوتا مجھے مشین کا وہ پرزہ چاہیے جو چوری ہوگیا۔ خواہ کسی نے چرایا ہو۔ اگر وہ نہ ملا تو کل شام تک پولیس تمہیں گرفتار کرنے آجائے گی۔"

میں انہیں دھمکیاں دے کر باقی دو کی تلاش میں نکلا' پتا چلا وہ اپنے پتے پر نہیں ہیں۔ ان کے پڑوسی نے کہا۔ "وہ اپنے گاؤں واپس جانے کی بات کر رہے تھے۔"

"کیا آپ لوگوں میں سے کسی کو ان کے گاؤں کا پتا معلوم ہے۔"

ایک شخص کو معلوم تھا۔ میں نے اس سے پوچھ کر پتا نوٹ کر لیا۔ ان کی تصویریں پہلے ہی میرے پاس تھیں۔ میں کسی کو کام دینے سے پہلے اُس کی تصویریں ضرور اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا۔ میں نے واپس آکر کنور آفتاب خلجی کو تمام حالات بتائے۔ اس کے بعد ہم دونوں پولیس اسٹیشن گئے۔ وہاں کنور آفتاب خلجی نے پولیس آفیسر سے درخواست کی چوری کی ایک رپورٹ خفیہ طور پر لکھی جائے......... ایف' آئی' آر درج نہ کی جائے' مجرموں کو چپ چاپ پکڑنا ہے۔ ہم اس کی تشہیر نہیں چاہتے۔

آفیسر نے ہمارے ساتھ مکمل تعاون کا وعدہ کیا۔ ہم وہاں سے چلے آئے لیکن ہم مطمئن نہیں تھے۔ کنور آفتاب خلجی پیش آنے والی بدنامی سے پریشان تھے اور میری پریشانی تو ایک ڈوبنے والے کی پریشانی تھی۔ میرے ہاتھ سے اتنا بڑا ٹھیکہ نکلا جا رہا تھا۔ اگر ایک بار کنٹریکٹ ہاتھ سے نکل جاتا تو کنور آفتاب خلجی جیسے بڑے کنٹریکٹروں کی نظروں میں میرا کیریئر خراب ہو جاتا۔

شام کے سات بجے فیروزہ کا خیال آیا۔ میں نے غصے سے ایک طرف تھوک دیا۔ یہاں میں بربادی کے دہانے تک پہنچ رہا تھا اور کمبخت کلوٹی یاد آرہی تھی۔ میں نے صبح گھر سے نکلتے وقت غصہ ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب میں اس کی زندگی سے دور ہو چکا ہوں اور ایسی کمتر لڑکیوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ یہ میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ اب یہ ٹھیکہ ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ اس کے بعد میری آمدنی محدود ہوتی۔ ایسے میں نہ تو میں اس کے لیے کوئی فلیٹ خرید سکتا تھا اور نہ ہی ماہانہ دو ہزار روپیہ ادا کر سکتا تھا۔

میں ساڑھے سات بجے گھر پہنچا۔ فیروزہ وہاں موجود تھی۔ اسے آٹھ بجے گھر جانا تھا۔ میں نے اسے ناگواری سے دیکھا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میری ساس اپنے انتخاب پر

مسکرا رہی تھی۔ میں نے الماری سے.......... ایک بوتل نکالی۔ فریج سے سوڈے کی ایک بوتل اور ایک گلاس لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا اور اپنی ساس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر اپنے لیے پیگ بنانے لگا۔ وہ ممتا بھرے انداز میں بولی۔ "دن بھر تھک جاتے ہوگے' پینا ضروری ہے لیکن بیٹا! زیادہ نہ پیا کرو۔ بہکنے لگتے ہو۔"

میں نے ایک ہی سانس میں پہلا جام خالی کردیا۔ دوسرا جام بنانے کے دوران کن انکھیوں سے کچن کی طرف دیکھا۔ وہ کچن کے دروازے کی آڑ میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اور بڑا جام بنایا اسے ہاتھ میں لے کر فضا میں یوں بلند کیا جیسے چیئرز کہہ رہا ہوں لیکن میں اسے دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں کتنی پی رہا ہوں اور میں وہ جام بھی پی گیا۔

نشہ تیزی سے چڑھنے لگا تو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ میں اپنی بیوی اور ساس سے نفرت کی وجہ سے نہیں پی رہا ہوں۔ جو ٹھیکہ میرے ہاتھ سے نکل رہا تھا' میں اس کا غم غلط کرنے کے لیے نہیں پی رہا ہوں۔ محض اس لیے پی رہا ہوں کہ آٹھ بجے فیروزہ سے ملاقات نہ کرسکوں۔ ملاقات نہیں کروں گا تو رات بھی نیند نہیں آئے گی اور پیتا رہوں گا تو مدہوش ہوکر سوجاؤں گا۔

پھر میں رفتہ رفتہ مدہوش ہوگیا۔ صبح آنکھ کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔ میں فوراً ہی اُٹھ کر باتھ روم میں گیا۔ وہاں سے واپس آیا' لباس تبدیل کرنے کے بعد ناشتے کی میز پر پہنچا' ڈرائنگ روم سے میری ساس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب نہیں ہوتی تھی تو دور ہی سے آواز سنائی دیتی تھی گویا یہ دھمکیاں دیتی رہتی تھی کہ میں ملازمہ سے فری ہونے کی کوشش نہ کروں۔

اتنی کڑی نگرانی کے باوجود فیرزوہ ناشتے کی ٹرے لے کر آئی۔ اسے میرے سامنے رکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "آپ کو زیادہ نہیں پینا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی وہ فوراً کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کی یہ ادا مجھے بہت ہی اچھی لگی۔ اپنی جیت کا احساس ہوا اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ عورت سے کھنچے رہو تو وہ خود کھنچی چلی آتی ہے۔

اس روز میں بہت مصروف رہا۔ پولیس آفیسر سے بھی ملاقات کی۔ اس نے یقین



دلایا کہ جس پنڈ کے وہ رہنے والے ہیں' وہاں کے تھانے میں اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ جلد ہی پکڑے جائیں گے۔

میں مایوس ہوکر واپس آگیا۔ کنور آفتاب خلجی نے میرا منہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "منہ لٹکانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا اکثر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان کے نصیب جاگتے جاگتے سوجاتے ہیں۔"

یہ سن کر مجھے ایک دم سے فیروزہ یاد آگئی۔ میرے دماغ میں یہ سوال گونجنے لگا۔

"میں نے فیروزہ کو ٹھوکر ماری تھی یا اپنے نصیب کو؟"

میں فوراً ہی خلجی صاحب کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مجھے صرف ایک دن کی مہلت اور دیجئے۔ میرا دل کہتا ہے' چور بھی پکڑے جائیں گے اور وہ مال بھی۔"

کنور آفتاب خلجی نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر سر ہلا کر کہا۔ "اچھی بات ہے' ایک دن کی مہلت اور دیتا ہوں۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ شام کے سات بجے اسی اسٹریٹ میں گاڑی لے جاکر روک دی۔ اگلی سیٹ کا دوسرا دروازہ کھلا چھوڑ دیا پھر آرام سے بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ یہ معلوم تھا کہ وہ آٹھ بجے کے بعد کوٹھی سے باہر نکلے گی۔ اس کے باوجود میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میری بے چینی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ میرے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔

ٹھیک آٹھ بج کر بائیس منٹ پر وہ عقب نما آئینے میں نظر آئی۔ وہ کار کے قریب پہنچ کر رک گئی تھی۔ سوچتی ہوئی نظروں سے عقب نما آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ میں اس آئینے میں اُسے نظر آرہا تھا۔ پھر وہ سر جھکا کر آگے بڑھی۔ میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر اس دروازے کو بند کردیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی' اس نے پوچھا۔

"کیا غصہ ختم ہوگیا یا کچھ کم ہوا ہے؟"

"تم مجھے غصہ دلاتی ہو' میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتیں۔ جانتی ہو' میری ساس ویری امپورٹنٹ لیڈیز ایسوسی ایشن کی چیئرپرسن ہیں اور بھی بڑے بڑے ذرائع کی مالک ہیں۔"

بڑی بڑی بیگمات سے ان کے تعلقات ہیں۔ دوسری شادی کروں گا تو اس سوسائٹی میں میرا جینا محال کردیں گے۔"

وہ بولی۔ "انسان بہت زیادہ کا لالچ نہ کرے۔ تھوڑا حاصل کرے اور خوش رہے تو کیا بات نہیں بنتی؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"مطلب صاف ہے' آپ شادی نہیں کرسکتے۔ میں شادی کے بغیر آپ کو نہیں مل سکتی۔ صرف میری دوستی مل رہی ہے' اسے آپ قبول کرلیں۔"

میں نے دل ہی دل میں دوستی کا حساب لگایا تو بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں۔ اول تو یہ کہ میں اسے دوست بنا کریوں بھی رکھنا چاہتا تھا تاکہ یہ خوش رہے تو میرا نصیب بھی خوش رہے۔ یہ ایک آزمائش تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا' واقعی میرے سر آئی ہوئی بلا ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ دوسرے اس کی دوستی سے یہ فائدہ تھا کہ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے متاثر ہوسکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم دوستی کی پیشکش نہ کرو تب بھی میں تمہارا ہوں۔ پہلے میں تمہارے پیچھے بھاگتا آیا ہوں۔ ہمیشہ اس گلی میں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ دوستی بہرحال رہے گی لیکن کب تک؟"

"جب تک آپ چاہیں گے۔"

"میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک دن تمہاری شادی ہوگی۔ تم اپنے شوہر کی پابند ہو جاؤ گی۔ پھر؟"

"پھر یہ کہ میں آپ کی خاطر شادی نہیں کروں گی۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر ڈرائیونگ کی طرف دھیان دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم میری خاطر ساری عمر یونہی بیٹھی رہو گی؟"

"ہاں۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا لیکن جانے کیوں آپ کو اپنے خیالوں میں آنے سے نہیں روک سکی۔ میں نے عہد کرلیا تھا کہ کوئی میری کتنی ہی تعریفیں کرے' میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں گی۔ میرا رنگ کالا ہے۔ کالک ہمیشہ چور بدمعاشوں کے منہ پر ملی جاتی ہے۔ شاید میں بھی کسی چور بدمعاش کے پلے باندھ دی جاؤں۔ آج تین دن



سے آپ میرے خیالوں میں جنگ کر رہے ہیں۔ یہ بات مانتی ہوں کہ دنیا میں کسی ایک کو اپنا ماننا ہی ہوگا۔ لہٰذا سوچا کہ شادی نہ کروں اور آپ کو اپنا مانتی رہوں لیکن عزت آبرو کے ساتھ۔"

میں چپ چاپ کڑھنے لگا۔ کمبخت میرے اتنے قریب تھی کہ دل میں اتر رہی تھی اور اتنی دور تھی کہ ہاتھ پکڑنے کا بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

میں اسے گارڈن تک چھوڑ کر واپس آگیا۔ میری ساس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "کنور آفتاب خلجی صاحب کا فون آیا تھا۔ انھوں نے کہا ہے' جیسے ہی آؤ ان سے فون پر رابطہ قائم کرلو۔"

میں نے ٹیلیفون کے پاس بیٹھ کر ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرکے رابطہ قائم کیا۔ ان کی آواز آتے ہی میں نے سلام کرکے پوچھا۔

"فرمائیے' کیا حکم ہے؟"

"بھئی خوشخبری ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے پولیس آفیسر میرے ہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ دونوں گرفتار ہوگئے ہیں اور چوری کا مال بھی پکڑا گیا ہے۔ کل دوپہر تک وہ مال کے ساتھ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں حیرانی سے خلا میں تکنے لگا۔ میرے ایک ہاتھ میں ریسیور تھا' دوسرے ہاتھ سے اپنا سر سہلا رہا تھا۔ ابھی شام تک میری آدھی جان نکل چکی تھی۔ اتنا بڑا کنٹریکٹ ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ کیا اس لیے کہ میں فیروزہ سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا تھا اور اب جبکہ دوبارہ وہ ملی تو وہ ہاتھ سے نکلنے والا کنٹریکٹ پھر میرے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔ دوسری طرف خلجی صاحب کہہ رہے تھے۔ "میاں! گھبرانے کی بات نہیں ہے' ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آدمی کو پرکھنا بہت مشکل ہے۔ چلو وہ دونوں چور نکلے' کوئی بات نہیں۔ اب اپنا کام پوری لگن سے مکمل کرو۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ میں نے ریسیور رکھ کر حالات کا جائزہ لیا۔ میرے دماغ نے کہا۔ "یہ بکواس ہے' کوئی خوش بخت یا بدبخت نہیں ہوتا۔ سب اپنی محنت سے اپنا نصیب بناتے

ہیں اور اس دنیا میں زندہ رہتے ہیں۔ اگر میں خلجی صاحب کے ساتھ تھانے نہ جاتا' اس پولیس افسر کا تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو نہ چور پکڑے جاتے نہ چوری کا مال۔ یہ تو سراسر عمل اور جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ کسی کی خوش قدمی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں سوچ رہا تھا اور خلا میں تک رہا تھا۔ خلا میں تکنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کامیاب لوگ کبھی یوں منہ اُٹھا کر نہیں تکتے۔ جو ناکام اور نامراد ہوتے ہیں انھیں بہت کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے خلا میں فیروزہ کی صورت نظر آرہی تھی۔

میرے دماغ میں پھر یہ سوال پیدا ہوا' کیا میں پھر فیروزہ کو آزماؤں؟ خواہ مخواہ وہ اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے' میری زندگی کا ایک اہم جزو بننا چاہتی ہے۔ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اس کے بغیر میں ترقی نہیں کرسکتا' دولت مند نہیں بن سکتا۔ کیا میں اسے ٹھوکر ماروں پھر ایک بار آزماؤں؟

فوراً ہی میرا ایک ہاتھ کان پر پہنچ گیا۔ میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں' اب تو بھی کسی صورت نہیں آزماؤں گا۔ خواہ فیروزہ کی اہمیت ہو یا نہ ہو' میں اسے خوش رکھوں گا۔"

اس رات مجھے گہری نیند آئی صبح اُٹھا تو سات بجے تھے۔ میں بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا حالانکہ اپنی ساس اور بیوی کی موجودگی میں اسے نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اس کا انتظار تھا۔

آٹھ بج کر بیس منٹ پر میں باہر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے' آپ کی وہ ملازمہ آج نہیں آئی؟"

"میں خود حیران ہوں' وہ کیوں نہیں آئی۔ ویسے لڑکی بڑی محنتی اور خدمت گزار ہے۔ گھر کا کام بڑے سلیقے سے کرتی ہے۔ کوئی دوسری ہوتی تو لیٹ آنے پر اسے باہر ہی واپس کردیتی لیکن وہ آئے گی تو ڈانٹ ڈپٹ کر پھر کام سے لگادوں گی۔"

میں بے اختیار اس کی حمایت میں کچھ کہنا چاہتا تھا پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جاتے جاتے پلٹ کر فون کے پاس آکر ریسیور کو اٹھایا۔ کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف سے فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی



میرے ابو کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں کام پر نہیں آسکوں گی۔ بیگم صاحبہ سے کہہ کر مجھے دو دن کی چھٹی دلادیں۔

میں نے اس کی آواز پہچاننے کے باوجود انجان بن کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں فیروزہ بول رہی ہوں۔ کیا آپ نہیں پہچان رہے ہیں؟"

"بھئی تم فیروزہ ہو تو بیگم صاحبہ یہاں کھڑی ہوئی ہیں' اُن سے بات کرو۔"

میں نے ریسیور اپنی ساس کو دے دیا۔ وہ فون پر اس کی باتیں سنتی رہیں پھر انھوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے' تم اپنے باپ کے سوئم کے بعد ہی آنا۔ اس سلسلے میں جتنی رقم کی ضرورت ہو' مجھے بتادو۔ میں ویری امپورٹنٹ لیڈیز ایسوسی ایشن کے فنڈ سے رقم پاس کرالوں گی۔"

یہ کہہ کر میری ساس نے فیروزہ کی بات سنی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا منہ بگڑ گیا۔ وہ غرا کر بولیں۔ "اے لڑکی! میں تجھے غریب سمجھ کر مدد کرنا چاہتی ہوں اور تُو اسے خیرات سمجھتی ہے۔"

پھر انھوں نے فیروزہ کی تھوڑی سی بات سنی۔ اس کے بعد ناگواری سے کہا۔ "اچھا اچھا' اپنی محنت کے پیسے سے باپ کو دفنانا چاہتی ہو' تمھاری مرضی ہے۔ میں تو نیکی کرنا چاہتی تھی۔ تم قبول نہیں کروگی تو میں اسے دریا میں ڈال دوں گی۔"

انھوں نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ میں نے ٹیلیفون کی جانب حسرت سے دیکھا۔ اگر ساس موجود نہیں ہوتی تو میں فیروزہ کو جی بھر کر تسلیاں دیتا۔ ایسے ہی وقت محبت زیادہ سے زیادہ جتائی جاتی ہے۔ وہ میرے پاس ہوتی یا میں کسی طرح اس کے پاس پہنچ جاتا تو اتنی اپنائیت سے تعزیت کرتا کہ مجھ سے دور بھاگنے والی میری طرف کھنچی چلی آتی' میں نے سوچا یہ بہترین موقع ہے' اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے اسے آنسو پونچھنے کے لیے میرے رومال کی ضرورت ہو۔

میں کار میں آکر بیٹھ گیا۔ اب مجھے بیوی اور ساس کا ڈر نہیں تھا۔ کوٹھی سے نکلتے ہی میں آزاد ہوجاتا تھا۔ کار میرے پاس تھی' کسی وقت بھی اس کے پاس پہنچ سکتا تھا لیکن

مجھے دفتر میں بھی حاضر رہنا تھا اور سائٹ پر جا کر کام کی رفتار کو بھی دیکھنا تھا۔

میں نے دوپہر تک بہتیرے کام نمٹا لیے جو رہ گئے' اُن کی ذمے داری ماتحتوں پر ڈال کے پاکستان کوارٹرز کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کہاں رہتی تھی؟ اس کا مکان مجھے معلوم نہیں تھا لیکن یہ اُمید تھی کہ اس علاقے سے کہیں میت اُٹھ رہی ہوگی تو پتا چل جائے گا۔ یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس علاقے سے اگر دو میتیں اُٹھ رہی ہوں تو کیسے پتا چلے گا؟

میں نے اپنے آپ کو سمجھایا' ایسا شاذو نادر ہی ہوتا ہے' ورنہ ایک محلے سے ایک ہی میت اُٹھتی ہے۔ ایک گلی میں پہنچا تو دور ہی سے جنازہ نظر آیا۔ میں نے وہاں پہنچ کر اس دروازے کو دیکھا جس کے سامنے سے جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ لوگ اسے قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ دو چار گلیوں کے چکر لگائے وہاں دور تک کسی گلی میں کوئی اور میت نظر نہیں آئی۔ پھر میں نے اس مکان کے سامنے پہنچ کر آس پاس دیکھا۔ جو مرد حضرات تھے' وہ جنازے کے ساتھ چلے گئے تھے۔ عورتیں اپنے گھروں میں ہوں گی فیروزہ کا مکان بالکل خاموش اور ویران سا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر خاموشی رہی لیکن دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ کھولنے والی فیروزہ ہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ.......... حیران رہ گئی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اس کے دروازے تک پہنچ جاؤں گا۔ بے چاری پچھلی رات سے اس قدر روتی رہی تھی کہ آنکھیں موٹی موٹی ہوگئیں تھیں۔ ایک تو پہلے ہی ہرنی جیسی تھیں۔ آنسوؤں سے ڈھل کر صاف و شفاف ہوگئی تھیں' مجھے بہت متاثر کر رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ فون پر یہ خبر سنتے ہی آنا چاہتا تھا مگر بہت سی مجبوریاں تھیں۔ فوراً ہی اپنا کام نمٹا کر آیا ہوں۔"

اس نے سر گھما کر اپنے مکان کے اندر دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں محلے کی کچھ عورتیں آئی تھیں' ابھی ابھی گئی ہیں۔ ایک بوڑھی خاتون رہ گئی ہیں۔ پھر بھی محلے والوں نے دیکھا تو کیا سوچیں گے۔"

میں نے اپنے دفتر کا ٹیلیفون نمبر بتاتے ہوئے کہا۔ "اسے یاد رکھو۔ میں ایک گھنٹے



بعد وہاں پہنچوں گا اور وہاں سے اس وقت تک نہیں اُٹھوں گا جب تک تمہاری آواز سنائی نہیں دے گی۔"

"میں مجبور ہوں۔ ابھی گھر سے نہیں نکل سکتی۔"

"تمہارے گھر سے پبلک ٹیلیفون کتنی دور ہے۔"

"مجھے مین روڈ تک جانا پڑتا ہے۔"

"کسی بھی بہانے سے جا سکتی ہو۔ میں انتظار کروں گا۔"

یہ کہتے ہی میں وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ دو قدم آگے جا کر رک گیا۔ اسے گھوم کر دیکھا۔ وہ بھی دروازے پر کھڑی مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی اپنے کو دیکھ رہی ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں' میں ہی ایک اپنا تھا جو اتنی دور سے اپنائیت کا ثبوت دینے آیا تھا اور اب اس سے گفتگو کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اسے پھر فون نمبر یاد دلایا اور وہاں سے چلا آیا۔ ایک بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ لڑکیاں بہت محتاط ہوں تو مشکل ہو جاتی ہے آتی بھی ہیں تو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ فیروزہ بھی ایسی ہی تھی۔ میں اتنی دور سے تعزیت کے لیے آیا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ اپنی بدنامی سے ڈر رہی تھی۔ لیلیٰ تو مجنوں کو دیکھتے ہی محل سے نکل آتی تھی۔

آدمی بعض اوقات اپنے مطالبے کے متعلق خود صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا کہ وہ کسی چیز کا مطالبہ کیوں کر رہا ہے۔ میں اُسے اپنی خوش قسمتی کا ذریعہ سمجھ رہا تھا۔ جب سے آئی تھی لاکھوں کا کاروبار ہو رہا تھا۔ نقد رقمیں ملتی جا رہی تھیں۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ وہ میری بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ میں اسے اپنی تقدیر بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گویا وہ میری ضد بن گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابھی اس کے گھر سے باپ کی میت اٹھی ہے' وہ مین روڈ تک آکر فون پر گفتگو نہیں کر سکے گی' میں اسے آزمائش میں ڈال کر چلا آیا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مجھ سے کترانے والی' میرے اس جذبے سے کتنی متاثر ہوئی ہے کہ میں بڑی دور سے تعزیت کے لیے آیا تھا؟

پانچ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بیگم صاحبہ! میں فیروزہ بول رہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا' اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے اس لیے وہ بیگم صاحبہ کہہ کر مجھے محتاط رہنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ میں نے آہستگی سے پوچھا۔ "کیا براہ راست گفتگو کرنا منع ہے؟"

"ہاں' میں یتیم ہو چکی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔ گھر سے اکیلی نکلوں گی تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ نوکری پر جانے کی بات اور ہے۔ ابھی میں پڑوس کی ایک خاتون کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔"

"مجھے تمھارے والد کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ میں تصور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تنہا' بے یارومددگار میری طرف آنکھیں اُٹھا کر دیکھ رہی ہو اور میں فیصلہ کر رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"بیگم صاحبہ! آپ نے کہا تھا' میں آپ کے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتی ہوں۔ پہلے میں ابو کی وجہ سے نہیں رہ سکتی تھی۔ اب تنہا ہوں۔ اتنی دور سے آنا جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سوئم کے بعد اپنا مختصر سامان لے کر سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو جاؤں۔"

"فیروزہ! ایسی نادانی نہ کرنا۔ تم وہاں سرونٹ کوارٹر میں رہوگی تو میں تم سے ملاقات نہیں کرسکوں گا۔ تم بس اسٹاپ کی طرف جاتی ہو تو ملنے کی آس رہتی ہے۔ میری ایک بات مان لو۔ سوئم کے بعد سیدھی کوٹھی میں نہ آنا۔ میں اپنے علاقے کے اسی بس اسٹاپ پر تمھارا انتظار کروں گا۔"

"اچھی بات ہے بیگم صاحبہ! میں آپ کے حکم کے مطابق نو بجے پہنچ جاؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے ضمیر کا حکم مانتی ہیں۔ میں جانتا تھا وہ آئے گی لیکن حالات سے مجبور ہو کر آئے گی۔ اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ جانے کے بعد بدنامیاں اور رسوائیاں مول لینا نہیں چاہے گی۔ اتنی دور سے تنہا نوکری پر آنا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ ہماری کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتی تھی لیکن ایک تو مجھ سے ملاقات نہ ہوسکتی دوسرے وہ میری ساس کی بدمزاجی کی بہت زیادہ متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ صرف نوکری کرنے کے اوقات میں انھیں برداشت کرلیتی



تھی۔ وہ یقیناً ایسی پناہ کے متعلق سوچ رہی ہوگی جہاں اسے سکون مل سکے اور اس کی نیک نامی برقرار رہ سکے۔

میں نے اپنے آفس کلرک سے کہا۔ "آج کا اخبار دیکھو' اسٹیٹ ایجنسی وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے معلوم کرو' دو سو گز کے پلاٹ پر بنے ہوئے مکانات کی کیا قیمت ہے یا آج کل فلیٹس کی قیمتیں کیا ہیں؟"

اس نے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔ "سر! میرے ایک دور کے عزیز فیڈرل بی ایریا میں رہتے ہیں۔ ان کا دو سو گز کا مکان ہے۔ گھر میں ٹیلیفون بھی ہے۔ وہ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ آج کے اخبار میں ان کا اشتہار بھی موجود ہے۔" اس نے وہ اشتہار مجھے دکھایا۔ میں نے اس کے مطابق ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر میں نے معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا چھوٹا سا مکان ہے مگر خوبصورت ہے۔ بڑی بات یہ کہ کارنر پلاٹ ہے۔ میں بھی ایسا ہی مکان چاہتا تھا جہاں میں فیروزہ کو رکھوں تو کچھ رازداری رہے۔ کارنر کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک گوشے میں رہے گی۔ اس علاقے میں اس کا مکان الگ تھلگ رہے گا۔ بہت کم لوگ اس کے متعلق جان سکیں گے۔ یوں بھی کراچی شہر میں لوگ بڑے مصروف رہتے ہیں اور کچھ بے مروّت بھی ہوتے ہیں۔ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کے متعلق بہت کم معلومات رکھتا ہے۔

میرے پاس ایک لاکھ تھے اور مالک مکان اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ بتا رہا تھا۔ میں نے سوچا' جب تک وہ مکان میرے نام منتقل ہوگا' اس کی رجسٹری ہوگی' اس وقت تک مزید پچاس ہزار روپے کا بندوبست کرلوں گا۔ یوں بھی آج کل بڑی بڑی رقمیں ہاتھ آرہی تھیں اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ فیروزہ ہاتھ میں رہے گی تو رقمیں یونہی آتی رہیں گی۔

وہ وعدے کے مطابق آگئی۔ میں نے ٹھیک نو بجے وہاں پہنچ کر دیکھا تو میرے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بسیں آجا رہی تھیں۔ ان میں مسافر چڑھ اتر رہے تھے لیکن وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ دیر سے آنکھ کھلی اس لیے آنے میں دیر ہوگئی۔"

وہ چپ چاپ میرے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کر

کے آگے بڑھایا۔ دیر تک وہ چپ رہی پھر اس نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”فیڈرل بی ایریا۔ میں نے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا مکان خریدا ہے اور اس کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔“

اس نے مجھے بے یقینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”آپ نے میرے لیے مکان کیوں خریدا؟“

”تم اس دنیا میں تنہا ہو‘ اب میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں۔“

”کس رشتے سے؟“

”رشتہ اگر نہیں ہے تو ہو جائے گا۔“

”کب ہو گا؟“

”پہلے اپنی رہائش کا مسئلہ حل کر لو۔“

”میں کسی کے مکان میں جا کر نہیں رہ سکتی۔“

”کیا میری کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہنا چاہتی ہو؟“

”مجبوری ہے۔ میں اور کیا کر سکتی ہوں؟“

”یہ بھی کیسی مجبوری ہے۔ میں تمہارا ہر طرح ساتھ دے رہا ہوں۔ کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتیں۔ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں‘ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا میں ہی تمہارے پیچھے بھاگتا رہوں؟ مجھے غصہ آئے گا تو میں ساری پابندیاں توڑ کر کوٹھی میں ہی تم سے ملنا جلنا شروع کر دوں گا۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کیا آپ میری ملازمت چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہی تو ایک روزگار کا ذریعہ ہے۔“

”اگر تم کوارٹر میں رہو گی تو میں تمہارے پاس آیا کروں گا۔ اپنی بیوی اور ساس کی پروا کیے بغیر۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ میں نے کن اکھیوں سے دیکھا‘ وہ پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا‘ کیا فیصلہ کرے۔ اس کی محتاط طبیعت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ مجھ پر اعتماد کرے اور میں جس گھر میں لے جا کر رکھوں وہاں رہائش



اختیار کرے۔

وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں بدنامی سے بچنے کے لیے کوارٹر میں رہنا چاہتی ہوں‘ آپ مجھے کسی مکان میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں کیا سمجھوں؟ کیا آپ بھی دنیا والوں کی طرح مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں نے خوب سوچ سمجھ کر ایسا مکان خریدا ہے جہاں تم بدنام نہیں ہو سکو گی۔ اس مکان کے ایک طرف اسپتال کا پچھلا حصہ ہے۔ اس کی باؤنڈری کی دیوار بہت اونچی ہے۔ اس دیوار کے ساتھ تقریباً چار ہزار گز کے فاصلے تک نہ دکانیں ہیں‘ نہ مکانات ہیں۔ یعنی ایک طرف بالکل ویرانی ہے‘ دوسری طرف جو مکانات ہیں‘ وہاں کے رہنے والے دفاتر کے اعلیٰ عہدے دار یا کاروباری لوگ ہیں۔ سب کاروں اور کوٹھیوں والے ہیں۔ ایسے لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ کون کس مکان میں کس طرح رہتا ہے یا کس کے گھر کون کون آتا ہے۔“

فیروزہ نے اپنے سر پر آنچل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”یعنی آپ بھی وہاں آیا کریں گے؟“

”میں اس طرح آؤں گا کہ تم بدنام نہیں ہو سکو گی اگر کوئی ایسا موقع آیا تو میں تمہیں بدنامی سے بچانے کے لیے اپنی عزت اور اپنے نام کو داؤ پر لگا دوں گا۔“

میں نے یہ بات بڑے جوش اور جذبے سے کہہ دی تھی اور اب جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ میں نے کن اکھیوں سے دیکھا‘ وہ اپنی آنکھ سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”آپ مجھے اس راستے پر لے جا رہے ہیں جہاں لڑکیاں بیوی بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتیں۔“

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا مگر کہنا چاہتا تھا کہ میں ایسے راستے پر لے جا رہا تھا تو وہ کیوں آرہی تھی؟ مانا کہ حالات مجبور کر رہے تھے۔ اگر کوئی اس کا نہیں تھا‘ وہ تنہا رہنے سے بدنام ہو سکتی تھی تو کسی بھی دو ٹکے کے آدمی سے شادی کر سکتی تھی۔ میری تو مجبوری تھی کہ وہ میرے لیے خوش قدم ثابت ہو رہی تھی۔

ایک ماہ کے اندر نئے مکان کا قبضہ مل گیا۔ اس کے مالکانہ حقوق کے کاغذات بھی مل گئے۔ میں نئے مکان کو ڈیکوریٹ کرنے کے لیے.......... فرنیچر اور ضروری سامان خریدنے لگا۔ وہ اُس مکان میں آگئی تھی۔ میں روز سامان خرید کر لاتا تھا اور وہ حیرانی سے پوچھتی تھی۔ "آخر اتنے قیمتی سامان کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو معمولی کُرسیوں پر بیٹھتی ہوں اور چارپائی پر سوتی ہوں۔"

"چارپائی کا مطلب ہے چارپاؤں۔ اب تم چوپایہ نہیں' میری طرح ایک اونچی سوسائٹی کی عورت ہو' اس مہنگے علاقے میں رہتی ہو۔ میں بہت جلد ایک کار بھی تمھارے لیے خریدوں گا۔"

"کیا میں اس کار میں آپ کے ساتھ اونچی سوسائٹی میں.......... جاسکوں گی؟"

میں ذرا دیر کے لیے چپ ہوگیا پھر میں نے اسے سمجھایا۔

"کب تک ضد کرتی رہوگی۔ جو مل رہا ہے اسے غنیمت جانو۔ ہوسکتا ہے آج تھوڑا ہے' کل زیادہ ملنے لگے۔"

میں نے اس کے قریب ہوکر کہا۔ "فیروزہ! ہر کام ایک ہاتھ سے نہیں ہوتا۔ دونوں ہاتھوں سے ہو اور ہم دونوں کے ہاتھ اس میں شامل رہے تو بات بنتی ہی چلی جائے گی۔"

وہ بولی۔ "نہیں' یہ سب بہلاوا ہے۔ یہ کوٹھی میری نہیں ہے۔ اس کوٹھی کی ایک چیز بھی میری نہیں ہے۔ میں کسی دن بھی دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکی جاسکتی ہوں۔"

"میں قسم کھاتا ہوں اور یہ لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ تمھیں یہاں سے نہیں نکالا جائے گا۔"

"اگر آپ کو لکھنا ہوتا تو کوٹھی کو اپنے نام سے خریدنے کے بجائے میرے نام سے خریدتے۔ مجھے اتنا نادان نہ سمجھیں۔"

"مجھے یاد نہیں رہا ورنہ یہ کوٹھی تمھارے نام کردیتا۔ بہرحال یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ میں جلدی اسے تمھارے نام کردوں گا۔"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں' میں لالچی نہیں ہوں ورنہ جس دن آپ نے اس



کوٹھی میں آنے کے لیے کہا تھا' اسی دن اسے اپنے نام کرانے کی ضد کرتی۔ یہاں کی سجاوٹ کے لیے جو فالتو سامان خریدا جارہا ہے اس کے بجائے سونے کے زیورات خریدنا شروع کردیتی لیکن مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔"

"پھر کیا چاہتی ہو؟"

"اپنا مان اور مرتبہ چاہتی ہوں۔ اگر آپ مجھے شریکِ حیات بنانا چاہتے ہیں تو چلیے' آج ہم کسی بہت بڑے ریستوران میں رات کا کھانا کھائیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"آپ کے بڑے بڑے لوگ مجھے آپ کے ساتھ دیکھیں گے اور میں یہ دیکھوں گی کہ آپ مجھے کس طرح اس سوسائٹی میں برداشت کر رہے ہیں؟"

میں نے اسے خاموش نظروں سے دیکھا۔ اس مکان میں ہم دو تھے' کوئی تیسرا نہیں آسکتا تھا۔ وہ ہمارا گھر تھا اور ہمیں کسی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک آمد بہار تھی لیکن وہ بہار کسی بڑے ریستوران میں لنچ یا ڈنر کے بعد آنا چاہتی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ بہت ہوچکا تھا اور اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"چلو تم جہاں کہوگی وہاں چلوں گا۔ ہم خوب تفریح کریں گے۔ رات کا کھانا کھائیں گے پھر یہاں آئیں گے۔"

پھر ہم نے خوب تفریح کی۔ یوں کہنا چاہیے کہ فیروزہ نے پہلی بار میرے ساتھ خوب شاپنگ کی۔ اس نے اپنے لیے ریڈی میڈ لباس بھی خریدے اور بننے سنورنے کی حسرت پوری کرنے کے لیے دنیا جہان کا میک اپ کا سامان بھی خریدا۔ میں اسے خوش کرنے کے لیے زیورات کا ایک سیٹ خریدنا چاہتا تھا' اس نے دو سیٹ خرید لیے۔ کہاں تو وہ مجھ سے کوئی تحفہ تک لینا پسند نہیں کرتی تھی اور کہاں یہ کہ ایک ہی شام میں اس نے پچپن ہزار روپے کی شاپنگ کی۔ میں نے دل ہی دل میں پریشان ہوکر سوچا' یہ تو بڑے گھاٹے کا سودا ہورہا ہے۔ یہ کمبخت عورتیں دیکھنے میں ہی معصوم ہوتی ہیں۔

فیروزہ چالاک تو بن رہی تھی مگر اپنے لیے گڑھا کھود رہی تھی۔ اس نے یہ نہیں

سوچا کہ میرے ساتھ گھوم پھر کر شاپنگ کرے گی، کسی بڑے ریستوران میں کھانا کھائے گی تو یہ بات میری بیوی اور ساس تک پہنچ جائے گی۔ پھر وہ ملازمت سے جائے گی۔

ملازمت چھوٹنے کا اسے خوف نہیں رہا تھا کیونکہ میں اس کے اخراجات برداشت کرنے کو تیار تھا لیکن فیروزہ کا ایک نقصان یہ تھا کہ میری بیوی اور ساس کھل کر اس کی مخالفت شروع کر دیتیں۔ اسے اتنا بدنام کرتیں کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ میں تو مرد ہوں، ہزار جھگڑوں کے باوجود اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ رہوں گا اور جب ان کے ساتھ رہوں گا تو دنیا کو منہ بھی دکھاتا رہوں گا۔

فیروزہ کا دوسرا نقصان یہ تھا کہ پچپن ہزار کی شاپنگ کرا دینے کے بعد میں اتنا احمق نہیں تھا کہ وہ کوٹھی بھی اس کے نام کر دیتا۔ کوئی دو ٹکے کا آدمی اس سے نکاح پڑھاتا تو وہ بمشکل مہر کی رقم پانچ سو روپے دیتا، پچپن ہزار روپے بہت تھے۔ وہ یہ قرضہ کبھی چکا نہ سکے گی۔

ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران اس نے پوچھا۔ "کیا آپ واقعی وہ کوٹھی میرے نام کر دیں گے؟"

"ہاں، کر دوں گا۔"

"کیا آپ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا لیں گے؟"

"میں نے زبان دی ہے اور اپنی زبان پر قائم رہوں گا۔"

"پھر تو میں کوٹھی میں کام کرنے نہیں جاؤں گی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیوں؟"

"جب میں ایک کوٹھی میں رہتی ہوں، ایک بڑے علاقے میں میری رہائش ہے، لوگ مجھے ایک اچھی پوزیشن میں دیکھتے ہیں، آپ میرے ماہانہ اخراجات پورے کرتے رہیں گے تو کوٹھی میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔ ایک بار میں نے تم سے کہا تھا، میں اپنی بیوی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک تو وہ بھینگی ہے اس پر اپاہج ہے۔ اس کی ماں نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ ایسی ساس کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں۔"



فیروزہ نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے، میں نے اپنی ماں سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ختم کر دیا ہے۔ آپ مجھے شریکِ حیات بنائیں گے تو ساس کا کوئی جھمیلا نہیں ہوگا۔"

"فی الحال جو مصیبت ہے اسے دور کرنے کی بات کرو۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟"

"میں کس طرح آپ کا ساتھ دے سکتی ہوں؟"

میں نے کھاتے کھاتے سر اٹھا کر آس پاس دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔ "یہ باتیں یہاں مناسب نہیں ہیں۔ گھر چل کر کریں گے۔"

گھر پہنچ کر فیروزہ نے نڈھال ہو جانے کے انداز میں صوفے پر گرتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لی اور کہا۔ "اللہ، میں تو تھک گئی۔"

میں نے پہلی بار حُسن کو اپنی انتہا کی طرف پرواز کرتے دیکھا۔ وہ ایک دم سے سمٹ گئی۔ میری نگاہوں کو سمجھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "کتنی گرمی ہے۔ جی گھبرا رہا ہے۔ میں ذرا غسل کر لوں۔" وہ جانا چاہتی تھی، میں نے راستہ روک لیا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا؟"

"اپنا وعدہ بھول رہی ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "آپ ہوٹل میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے تھے۔"

"وہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"دیکھیے، ہر عورت شریکِ حیات بننا چاہتی ہے میں بھی چاہتی ہوں۔ اگر کسی طرح مجھے آپ کی بیوی کی جگہ مل جائے تو میں ہر طرح آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ہم اس پر بعد میں بحث کریں گے۔"

"ابھی تو مجھے جانے دیں۔ میں پسینے سے بہت گھبراتی ہوں۔"

میں نے جانے کا راستہ دے دیا۔ وہ اپنے بیڈروم میں گئی پھر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ابھی آئے گی لیکن ایسا کہنے سے انتظار کرنے والے کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ہے۔ ابھی آنے کا مطلب ہے، اگلے ہی لمحے آ جانا۔ اگلا لمحہ پلک جھپکتے ہی آ جاتا ہے۔ میں پلکیں جھپکے بغیر اس بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ آدمی شوقِ

دید میں پلکیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔ میں بھی آدھے گھنٹے تک شاید بھول گیا تھا' دروازہ کھلا تو یاد آیا......... فوراً ہی میں اٹھ کھڑا ہوگیا۔ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دوسرے لباس میں تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹ رکھا تھا۔ بہت ہی صاف ستھری' نکھری نکھری سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آیئے' یہاں بیٹھ جایئے۔ میز پر کاغذ اور قلم رکھا ہوا ہے۔"

میں نے آگے بڑھ کر میز پر رکھے کاغذ اور قلم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس لیے؟"

"ہم آج اپنے مستقبل کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس لیے یہ بنیاد تحریری ہونا چاہیے۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اس میں سمجھنے کی بات ہی کیا ہے۔ میں اپنی ضمانت چاہتی ہوں۔ اگر آپ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں اور اس میں میرا تعاون بھی چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ جو جرم ہم کرنے جارہے ہیں' اس میں برابر کے شریک ہوں۔"

"بیشک ہم برابر کے شریک ہیں۔"

"اگر کسی مرحلے پر آپ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں تنہا مجرم کہلاؤں گی' آپ صاف بچ نکلیں گے۔ میرا کیا بنے گا؟"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"ہاں ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے تحریری بیان چاہتی ہوں۔"

میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو کہ اپنا ہاتھ کاٹ کر تمھارے پاس رکھ دوں؟"

"کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو کہ تمھارے ہاتھوں کھلونا بن کر تمھاری بیوی کی قاتلہ کہلاؤں؟"

میں نے ناگواری سے کاغذ اور قلم کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمھارے تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تنہا واجدہ کو اپنے راستے سے ہٹا سکتا ہوں۔"



وہ میرے قریب آکر فرش پر دوزانو ہوگئی۔ میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ تو ناراض ہوگئے۔ میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ چلیے آپ اسے تحریر میں نہ لائیں لیکن مجھے بتائیں تو سہی' آپ کی پلاننگ کیا ہے؟"

میں نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں میری پلاننگ سے کیا غرض ہے تم تو خودغرض ہو۔"

"اگر خودغرض ہوتی تو آپ سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ ہوتی۔ آپ میرے لیے بہت کچھ کررہے ہیں۔ میں بھی بے مروت نہیں ہوں ایسے اہم معاملے میں آپ کا ساتھ ضرور دوں گی' آپ ایک بار مجھے آزمائیں تو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا' وہ مجھے بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ پچپن ہزار خرچ کرنے کے بعد میں فیصلہ کرچکا تھا' محبت کی یہ بازی ضرور جیت کرجاؤں گا۔ میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ فرش سے اٹھو' میں تمھیں بتاؤں گا۔"

"جی نہیں' میں تو آپ کے قدموں میں ہوں۔ آپ جب چاہیں' قدموں سے اٹھا کر سرپر بٹھا سکتے ہیں یا ٹھوکر مار سکتے ہیں۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ٹھوکر تو واجدہ کو ماروں گا۔ بہت عرصے سے میرے دماغ میں ایک منصوبہ پک رہا ہے۔ اگر تم میرے کہنے پر عمل کروگی تو دو ہفتے کے اندر اس کی موت واقع ہوجائے گی اور کسی کو قتل کا شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے پاس ایک زہر ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔"

"لیکن زہر سے ہونے والی موت فوراً ظاہر ہوجاتی ہے۔"

"زہر ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت آہستہ آہستہ اثر کرتے ہیں۔ میرے پاس ایسا ہی ایک سست الاثر زہر ہے۔ میں چاہتا ہوں' تم اس کوٹھی کا کام نہ چھوڑو۔ رات کے کھانے کے بعد واجدہ سونے سے پہلے دوا کھاتی ہے اور دوا کے ساتھ دودھ پینا لازمی ہوتا ہے۔ اس دودھ میں تم ایک قطرہ زہر ٹپکا دیا کروگی۔ ایک قطرہ بہت ہوتا ہے۔ وہ روز ایک قطرہ زہر' دودھ کے ساتھ پیتی رہے گی۔ سات دن کے بعد تمھارا کام ختم ہوجائے گا۔ وہ ایک

دم نہیں مرے گی' آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتی جائے گی۔ اس کے اعصاب اتنے کمزور ہوجائیں گے کہ ڈاکٹر اسے اعصابی کمزوری ہی سمجھتے اور بتاتے رہیں گے۔ اعصابی مریض کسی وقت بھی جسمانی کمزوری اور ذہنی انتشار کا شکار ہو کر مرسکتے ہیں۔ وہ بھی مرجائے گی۔"

میں نے اسے فرش سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرا منصوبہ بالکل مکمل ہے۔ اسے زہر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں کبھی اس کے سامنے خدمت گزار خاوند کی طرح ایک پیالی چائے لے کر بھی نہیں گیا' اب خود دودھ لے کر جاؤں گا تو مشکوک ہوجاؤں گا۔ یہ تو کوئی ملازمہ ہی کرسکتی ہے لہٰذا تمھیں اس کوٹھی میں کام کرتے رہنا چاہیے۔"

اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ واجدہ کی موت کے بعد تم مجھ سے شادی کرلو گے؟"

"مجھے ایک شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔ تم میری ہم مزاج ہو اور میں تمھیں اپنی خوش نصیبی کا ذریعہ بھی سمجھتا ہوں' اس لیے ضرور شریکِ حیات بناؤں گا۔"

"قسمیں تو بہت کھا رہے ہو' وعدے بھی کر رہے ہو' یقین بھی دلا رہے ہو لیکن یقین دلانے کے لیے تحریر دینے سے انکار کرتے ہو۔"

"کیا تمھیں میری زبان پر بھروسہ نہیں ہے؟"

"اگر یہی سوال میں کروں کہ کیا میری زبان پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں' آپ کی تحریر کی میں کسی کو.......... ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی۔ ایسی جگہ چھپا کر رکھوں گی کہ وہ صرف میرے اور تمھارے درمیان ضمانت کے طور پر محفوظ رہے گی۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "دیکھو' میں تمھاری محبت کا اسیر ہوں اور تم خواہ مخواہ کی بحث چھیڑ رہی ہو۔"

"میری باتیں خواہ مخواہ کی ہوگئیں اور آپ کی ضرورت بہت زیادہ اہم ہے۔ خود غرض میں ہوں کہ آپ ہیں' کیا آپ اتنا بھی نہیں لکھ سکتے کہ اگر پہلی بیوی نہ رہی تو آپ مجھ سے ہی شادی کریں گے؟"

"پہلی بیوی کے نہ رہنے کا مطلب تو یہی ہوا کہ میرے دماغ میں اس کی ہلاکت کا



منصوبہ پوشیدہ ہے۔ کیا تم مجھے ہیرا پھیری سے پھانسنا چاہتی ہو؟"

"کون کس کو پھانس رہا ہے' یہ سامنے کی بات ہے۔ آپ نے میرے لئے یہ مکان خریدا' اتنا قیمتی آرائشی سامان خریدا۔ آج مجھے ہزاروں روپے کی شاپنگ کرائی۔ میرے لیے آپ سب کچھ کر رہے ہیں' صرف لکھنے سے پرہیز کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا میں آپ کی دشمن ہوں؟"

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو سختی سے جکڑ کر کہا۔

"ہاں تم میری دشمن ہو۔ میرے صبر کو آزما رہی ہو۔ کیا تم میری گرفت سے نکل سکتی ہو؟"

اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "گرفت سے نکل جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں تو خود آپ کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں۔ البتہ جبروتشدد سے کام لیں گے تو میں چیخنا شروع کردوں گی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں' شریفوں کے اس محلے میں میری آواز کہاں تک پہنچے گی اور کیا نتیجہ نکلے گا اس کا؟"

میری گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ عزت والی وہ نہیں تھی' میں تھا یا شاید دونوں تھے وہ تنہائی میں بھی اپنی عزت کا پاس رکھتی تھی۔ میں لوگوں میں اپنی عزت بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ ہمارے ہاں عزت کا ایک ہی معیار نہیں ہوتا۔ یہ الگ الگ مقام پر الگ الگ حیثیت سے بنائی جاتی ہے۔

میں اسے بستر پر دھکیل کر تیزی سے الماری کے پاس آیا۔ اسے کھول کر ایک بوتل نکالی' کچن سے گلاس لیا پھر فریج سے سوڈے کی بوتل لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنی اپاہج بیوی کا ماتم نہیں کرسکتا تھا اور اس کو غصہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ فیروزہ میری بہت کچھ ہوسکتی تھی۔ مجھ سے بہت کچھ حاصل کرسکتی تھی مگر بڑی بدنصیب تھی۔ میری محبت سے محروم ہو رہی تھی اور میری نفرت کا سامان کر رہی تھی۔

میں نے پہلے بہت بڑا پیگ لیا پہلے ہی پیگ کے بعد اتنا حوصلہ پیدا ہوا کہ میں اسے باتیں سنا سکوں۔ میں نے دوسرا پیگ بنا کر گلاس ہاتھ میں لے کر بیڈروم کا رخ کیا۔ اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ میں تمھیں ٹھوکر مار کر اسی گھر

میں ایک سے ایک حسین عورت لا سکتا ہوں۔"

میں لڑکھڑاتا ہوا دوسرے بیڈ روم میں آیا' وہ وہاں نہیں تھی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے دوسرا پیگ وہیں کھڑے کھڑے حلق سے اتار لیا۔ اس کے بعد خالی گلاس کو فضا میں بلند کر کے یوں لہرایا جیسے پرچمِ بغاوت بلند کر کے اعلانِ جنگ کر رہا ہوں۔ "کہاں ہو تم؟"

اس کی آواز سنائی دی۔ "میں کچن میں ہوں۔"

میں جھومتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا تاکہ ایک اور پیگ پینے کے بعد کچھ اور ہمت آئے۔ میری کمزوری یہ تھی کہ اس نے چیخنے کی دھمکی دی تھی۔ اگر میں زیادہ نشے میں رہتا تو دھمکی کی پروا نہیں کرتا۔ شراب کا یہی ایک فائدہ ہے۔ نشے کی زیادتی میں مظلوم کی چیخ سنائی نہیں دیتی۔

میں نے تیسرا پیگ آدھا پینے کے بعد کچن کی طرف بڑھتے ہوئے اسے آواز دی پھر کچن کے اندر پہنچ گیا اور للکار کر پوچھا۔

"کہاں ہو تم؟"

بیڈ روم سے آواز آئی۔ "کیوں خواہ مخواہ چیخ رہے ہو۔ میں یہاں ہوں۔"

میں نے گلاس کو خالی کیا پھر ڈرائنگ روم میں آکر چوتھا گلاس بنایا۔ اسے ایک ایک گھونٹ پیتا ہوا بیڈ روم میں پہنچا۔ وہ کھڑکی کا پردہ درست کر رہی تھی۔ میں نے فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

"ہاہاہا' اب کہاں بچ کر جاؤ گی؟"

وہ بیزاری سے بولی۔ "تم اتنی کیوں پی لیتے ہو' اپنے پیروں پر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ دیکھو کس طرح ڈگمگا رہے ہو۔"

میں نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ سنبھل کر چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آگیا اور تن کر بولا۔ "دیکھو' میں اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں رہ سکتا' چل بھی سکتا ہوں۔"

میں نے دو چار لمبے لمبے گھونٹ حلق سے اتارے۔ وہ میرے قریب آکر میرے بازو



کو تھام کر بولی۔ "کیا تم اس بستر تک چل سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

میں نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ذرا لڑکھڑایا' پھر سنبھل کر چلتا ہوا بستر تک پہنچ گیا۔ میرا رخ بستر کی طرف تھا۔ اس نے کہا۔ "میری طرف گھوم جاؤ۔"

میں اس کی طرف گھوم گیا۔ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں آخری ایک دو گھونٹ رہ گئے ہیں۔ کیا انہیں پی سکتے ہو؟"

میں نے فوراً ہی گلاس منہ سے لگا لیا۔ فیروزہ نے گلاس میرے ہاتھ سے لیا۔ نہایت اطمینان سے میز کے پاس گئی' وہاں گلاس رکھنے کے بعد واپس میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم یہاں فاتح بن کر آئے ہو؟"

میں نے ایک مٹھی باندھ کر اسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟"

اس نے اپنی ایک انگلی میری طرف بڑھائی اور اسے میرے سینے پر رکھ کر کہا۔ "میرے فاتح' آرام سے سو جاؤ۔"

یہ کہتے ہی اس نے انگلی سے مجھے دھکا دیا۔ میں بستر پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ دوسری صبح آنکھ کھلی تو میں نے اپنی مردانگی پر لعنت بھیجی۔ یعنی ایک عورت نے صرف انگلی کے دھکے سے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ میں نے کان پکڑے اور توبہ کی آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ اگر عورت نے ایک انگلی سے دھکا دیا تھا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ تو انگلیوں پر نچاتی ہی ہے لیکن یہ کمبخت شراب اچھے سے اچھے مرد کو بھی اٹھا کر پٹخ دیتی ہے۔ دراصل کمزور شراب نے کیا تھا اور تحفظ فیروزہ نے حاصل کیا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو خوبصورت سے بستر پر پڑا تھا۔ میں نے اسے آواز دی' جواب نہیں ملا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے وہاں سے اُٹھ کر اسے کچن اور ڈرائنگ روم وغیرہ میں دیکھا' وہ کہیں نہیں تھی۔ واپس بیڈ روم میں آیا تو میز پر اس کوٹھی کی چابیاں اور ایک پرچی رکھی تھی۔ میں نے اسے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "میں بازار جا رہی ہوں۔ چابیوں کا ایک سیٹ میرے پاس ہے۔ آپ جاتے وقت کوٹھی کو لاک کر جائیں۔"

میرا انتظار نہ کریں۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا' اس پر آیا یا اپنی بے بسی پر۔ بہرحال میں نے غسل وغیرہ کیا۔ پچھلی شام میں نے اپنے لیے بھی کچھ سوٹ خریدے تھے۔ ان میں سے ایک پہن کر اپنی کار سنبھالی اور دفتر چلا گیا۔ وہاں پتا چلا' واجدہ نے دو مرتبہ فون کیا تھا۔ یقیناً پچھلی رات نہ آنے کے باعث وہ ماں بیٹی میری لیے پریشان ہوں گی اور نہ جانے کتنے واہموں میں گرفتار ہوں گی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ناپسندیدہ لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر کے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ واجدہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی پٹڑی بدلی۔ محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "واجدہ! مجھے افسوس ہے' میں پچھلی رات نہ آسکا' نہ ہی تمھیں اطلاع دے سکا دراصل میں نے ایک دوست کے ہاں بہت زیادہ پی لی تھی۔"

واجدہ نے پوچھا۔ "وہ دوست ہی تھا نا؟"

"تمھاری جان کی قسم دوست ہی تھا۔ ویسے تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ تمھاری امی نے یقیناً میرے پیچھے جاسوس لگا رکھے ہوں گے۔ اگر میں غلط راستے پر چلوں گا تو تمھیں فوراً خبر ہو جائے گی۔"

"آپ مجھے طعنہ نہ دیں۔ امی آپ کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ انھوں نے آپ کی حفاظت کے لیے کچھ آدمی مقرر کیے ہوں گے۔ آپ انھیں جاسوس سمجھ رہے ہیں۔ ویسے یہ آپ کا راتوں کو باہر رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

"مجبوری ہے۔ یقین نہ ہو تو اپنی امی سے کہو' معلومات حاصل کرلیں۔ آج کل سائیٹ پر اوور ٹائم ہو رہا ہے۔ رات کو بھی کام ہوتا ہے۔ میرا وہاں رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ شاید آج رات بھی رہنا ہو وہاں؟"

میں نے شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ شاید فیروزہ شام تک میرے حق میں موم ہو جائے۔

واجدہ نے پوچھا۔ "آپ دوپہر کو کھانے پر تو ضرور آئیں گے؟"

"ہاں' ضرور آؤں گا۔ آخر میرا گھر ہے۔ مجبوراً رات کو نہیں آسکتا۔ کھانے کے



لیے تو آسکتا ہوں۔"

میں نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد ریسیور رکھا۔ پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھایا تو فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "کیا اپنی بیوی اور ساس کے سامنے صفائی پیش کردی۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں واجدہ سے باتیں کر رہا تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں کوئی جادوگر نہیں ہوں' نہ ہی اتنی دور بیٹھ کر تمھارے فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتی ہوں۔ بھئی' عقل بھی کوئی چیز ہے۔ آپ رات بھر اپنے گھر سے غائب رہے تھے' یقیناً بیوی نے دفتر میں فون کیا ہوگا۔"

میں نے قائل ہو کر کہا۔ "ہاں' یہ قدرتی بات ہے۔ بہرحال مجھے افسوس ہے کہ پچھلی رات اوور ہوگیا تھا۔"

"آپ پینے کے بعد کب اوور نہیں ہوتے۔ مین نے کوٹھی میں بھی آپ کو اس حال میں دیکھا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم ناراض تو نہیں ہو؟"

اس نے کہا۔ "یہی میں پوچھنا چاہتی تھی۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گویا ہم ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہیں۔" پھر میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "فیروزہ' ریسیور میرے کان سے لگا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے تم میرے کانوں میں رس گھول رہی ہو۔ تمھاری آواز میں سنگیت کے سُر ہیں۔"

"عورت جب تک دور سے سنائی دے' سُریلی لگتی ہے۔"

میں نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ یہ کلوٹی کوئی بات نہیں رکھتی تھی' تڑ سے جواب دیتی تھی۔ میں نے اپنے موڈ کو درست کرتے ہوئے پوچھا۔ "اگر اعتراض نہ ہو تو شام کو آجاؤں۔"

"آپ کا گھر ہے۔ مجھے اعتراض کیا ہو سکتا ہے؟"

"مجھے تمھاری ضد اچھی نہیں لگتی۔ یہ لکھوانے والی ضد سے باز آجاؤ' باقی میں

تمھاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔"

"نہ تو میں آپ سے کوئی تحریر لکھوانا چاہتی ہوں اور نہ کسی عورت کی دشمن بن سکتی ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"درست کہہ رہی ہوں۔ اگرچہ میں نے پچھلی رات آپ سے واجدہ کے متعلق گفتگو کی تھی لیکن میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں اسے قتل کرنے کی سازش میں شریک ہو جاؤں۔"

"کیا تم فون پر ایسی گفتگو کر کے مجھے کسی طرح پھانسنا چاہتی ہو؟"

"آئندہ میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کروں گی جن سے آپ کے پھنسنے کا اندیشہ ہو۔ پھنسنے والے تو خود ہی جال میں چلے آتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو میں کچھ سنا رہی ہوں' اسے توجہ سے سنیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا سنا رہی ہو۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

میری ان باتوں کے دوران اچانک میری آواز سنائی دی۔ یہ حیرانی کی بات تھی۔ میں ریسیور کان سے لگائے بیٹھا ادھر سے گفتگو کر رہا تھا اور دوسری طرف بھی میری آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر میرے ہوش اُڑنے لگے۔ پچھلی رات میں نے واجدہ کو قتل کرنے کا جو منصوبہ پیش کیا تھا اور جو طریقہ کار بتایا تھا' وہ سب فیروزہ نے ریکارڈر کر لیا تھا۔ میں نے غصے سے چیختے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔ یہ تو ہماری پچھلی رات کی گفتگو ہے۔ کیا تم نے اسے ریکارڈ کیا ہے۔ کیسے ریکارڈ کیا ہے؟"

"میں نے آپ کو اسی لیے میز کے قریب بٹھا دیا تھا۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذ اور قلم کو آپ نے غصے سے پھینک دیا لیکن اس کے نیچے رکھا ہوا کیسٹ ریکارڈ آن تھا۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ پھر میں نے پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے مجھے پوری طرح پھانس لیا ہے۔ اب کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"کچھ نہیں' یہ تو محض حفاظتی اقدامات تھے۔"

"اچھا تو تم اس کیسٹ کے ذریعے مجھے بلیک میل کروگی اور مجھ سے جبراً شادی



کروگی۔"

"میں نہ تو جبر چاہتی ہوں اور نہ جبر کرتی ہوں۔ شادی راضی خوشی کا سودا ہوتا ہے۔ آپ کی خوشی ہوگی تو آپ کے قدموں میں ساری زندگی گزرادوں گی۔ ورنہ میں آپ کو کبھی اتنے قریب نہیں آنے دوں گی جس کے بعد میں خود اپنی نظروں سے گر جاؤں۔ اس کیسٹ کو میں نے دو مقاصد کے لیے ریکارڈ کیا ہے۔"

وہ ذرا چپ ہوئی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ "خاموش کیوں ہو؟ میں سُن رہا ہوں۔ بکواس کرو۔"

"وہ کہنے لگی۔ "پہلا مقصد تو یہ کہ آپ میرے ہاں خوشی سے روز آیا کریں لیکن مجھے ہاتھ بھی لگایا تو آپ کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

"یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ دوسرا مقصد بتاؤ؟"

"میں ایک عورت ہوں اور کسی دوسری عورت کی جان لے کر اپنا حق حاصل نہیں کر سکتی اور نہ ہی تمھیں اس کے خلاف قدم اُٹھانے دوں گی۔ اگر تم نے اسے قتل کرنے کی سازش کی یا اس کی موت واقع ہوئی تو میں اس کا پوسٹ مارٹم کراؤں گی اور یہ کیسٹ پولیس کے سامنے پیش کردوں گی۔"

میں نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا تم پاگل ہوگئی ہو۔ ایک عورت کو ختم کر کے میری شریکِ حیات بن سکتی ہو۔ میرے ساتھ دنیا جہان کی دولت تمھیں ملے گی اور تم ہو کہ اس عورت کی حفاظت کرنا چاہتی ہو۔"

"میں اس کی حفاظت کروں گی تو اللہ میری حفاظت کرے گا۔ بس ایک بات یاد رکھو۔ میں ان عوتوں میں سے ہوں جو کم ظرف نہیں ہوتیں۔"

میں نے ریسیور کو کریڈل کے اوپر پٹخ دیا۔ پتا نہیں کتنی گالیاں فیروزہ کے لیے دل سے نکل رہی تھیں مگر میں دفتر میں بلند آواز سے گالیاں نہیں بک سکتا تھا۔ کرسی سے اُٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ہمارے بزرگ سچ کہا کرتے تھے' چھوٹے لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیے۔ پاؤں تلے کی مٹی کو سر پر ڈالنے سے اپنا ہی سر خاک آلود ہوتا ہے' میں فیروزہ کو جیتنے کی خوشی میں بھول گیا تھا کہ وہ کم ظرف ہے' میرے احسانات کو بھلا کر مجھے ایک

کیسٹ کے ذریعے پھانسنے کی کوشش کرے گی اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی۔

میرے دل میں بار بار یہی خیال سر اُبھار رہا تھا کہ قانون کچھ دیر کے لیے اندھا ہو جائے۔ بس اتنی دیر کے لیے کہ میں اُسے قتل کردوں اور قتل کا سراغ نہ ملے۔ جس کیسٹ کے ذریعے وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے، وہ یقیناً اُس نئی کوٹھی میں ہوگا اور وہ کہاں لے جاکر رکھ سکتی ہے۔ اُس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے، کوئی راز دار سہیلی نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ میرے اس راز کو کسی دوسرے کے حوالے کردے۔ اگرچہ وہ مجھ سے دشمنی کر رہی تھی، اس کے باوجود مجھے دل کی گہرائیوں سے اعتماد تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ مجھے نقصان پہنچانے کے متعلق کبھی نہیں سوچے گی۔ صرف دھمکیاں دے دے کر مجھے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔

بس یہی سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ ایک معمولی سی لڑکی اور مجھے اپنی مٹھی میں رکھنا چاہیے، یہ میری توہین تھی۔

میں نے پھر ٹیلیفون کے قریب آکر ریسیور اٹھایا۔ اُس کے نمبر ڈائل کیے۔ جیسے ہی اُس کی آواز سنائی دی، میں نے غصے سے پوچھا۔ "تم خود کو کیا سمجھتی ہو۔ کیا تم کوئی حور پری ہو؟"

وہ بڑے تحمل سے بولی۔ "میں کالی رات ہوں اور اسی کالی رات کے لیے تم نے یہ کوٹھی خریدی ہے۔ تمہاری توقعات کے برعکس میں وہ کالی رات نہیں ہوں جو گناہوں کو چھپالیتی ہے۔ البتہ ایسی ضرور ہوں جو تمہارے ہونے والے جرائم کو چھپا رہی ہوں۔ تاکہ آئندہ ایسی کوئی حماقت نہ کرسکو۔"

"زیادہ دانش مند بننے کی کوشش مت کرو۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں اپنی شریک حیات سے نفرت کرتا ہوں؟ کیا میں اُسے سچ مچ قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو میں تمہیں دھوکا دے رہا تھا، تمہیں سبز باغ دکھا رہا تھا۔ ورنہ بیوی آخر بیوی ہوتی ہے۔ خواہ وہ بھینگی اور اپاہج کیوں نہ ہو۔ میں اپنی واجدہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میں کبھی اُسے قتل نہیں کرسکتا۔ تمہارے جیسی دو ٹکے کی چھوکری کے لیے اپنی معصوم اور مظلوم شریکِ حیات کو قتل کروں گا؟ توبہ توبہ، میں یہ جُرم کرنے سے پہلے خود مرجانا پسند کروں گا۔"



"شاباش۔" اس کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ مسکرا رہی ہوگی۔ اس کے لہجے سے یہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم جرائم کا جو دروازہ کھولنا چاہتے تھے، اس دروازے کی چابی میرے پاس ہے۔ اب تمہیں محبت کرنے والے شوہر کی طرح یہی سوچنا چاہیے کہ بیوی کو نقصان نہ پہنچے۔ ایسا ہونے سے پہلے تم اپنی جان اس پر قربان کردوگے۔ محبت کرنے والے شوہر تمہارے ہی جیسے ہوتے ہیں۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں ہیلو ہیلو کرتا ہی رہ گیا۔ اس کی اس حرکت پر میرا دماغ بُری طرح کھول اٹھا اور ریسیور کو مٹھی میں بھینچ کر یوں دیکھنے لگا جیسے کلوٹی کی گردن میری مٹھی میں آگئی ہو۔ زندگی میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب آدمی بے بسی سے کھڑا سوچتا رہ جاتا ہے، کیا کرے، کیا نہ کرے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے میں وہ غصے سے بے قابو ہونے لگتا ہے یا اپنے آپ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ خود کو سمجھانے لگا، میری بہت بڑی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔ اُسے محبت سے بہلا پھسلا کر کسی طرح وہ کیسٹ حاصل کرنا ہوگا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ مجھے کیسٹ تک پہنچنے کا کبھی موقع نہ دیتی۔ پھر بھی مجھے اپنے غصے کو کنٹرول کرنا تھا اور اُس کے سامنے ہمیشہ مسکراتے رہنے کی مشق کرنا تھی۔

میں دفتر سے اُٹھ کر سائیٹ کی طرف گیا۔ وہاں کام کی رفتار تسلی بخش تھی، پھر بھی کاریگروں اور مزدوروں کے ساتھ ایک گھنٹہ گزار کر سیدھا واجدہ کے پاس پہنچا۔ بیوی کے پاس بھی جانا ضروری تھا اور اب.......... یہ لازمی ہوگیا تھا۔ میں نے دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھایا۔ میرا دل نہ تو واجدہ کے پاس لگ رہا تھا، نہ دفتر میں اور نہ ہی سائیٹ پر۔ بس وہ ہی کلوٹی یاد آرہی تھی۔ جی چاہتا تھا کسی طرح اس پر غالب آجاؤں اور اپنی کمزوری کو اُس کے ہاتھ سے نکال کر لے آؤں۔

میں شام کو چار بجے اُس کے پاس پہنچا۔ میری گاڑی کی آواز سنتے ہی اس نے خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کرلیا تھا۔ میں نے دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیا دروازہ نہیں کھولو گی؟"

"ابھی کھولتی ہوں۔ ذرا دیر آپ ڈرائنگ روم میں انتظار کریں۔"

میں نے کہا۔ "فون پر 'تم' سے مخاطب کر رہی تھیں اور اب آپ پر اُتر آئی ہو۔"

"جیسا آپ کا رویہ ہوگا' جواباً وہی رویہ میں بھی اختیار کروں گی۔ پلیز آپ ڈرائنگ روم میں آرام سے تشریف رکھیں۔"

میں وہاں آکر بیٹھ گیا۔ الو کی پٹھی نخرے دکھا رہی تھی' انتظار کرا رہی تھی تاکہ میں بے کل رہوں.......... میں نے حقارت سے ڈرائنگ روم کے اس دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ داخل ہونے والی تھی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔

ہم سگریٹ کیوں پیتے ہیں یا پان کیوں چباتے ہیں۔ اگر ہم اس کا گہرائی سے جائزہ لیں تو پتا چلے' ہم کسی کمی کو پان کی طرح چبا کر تھوک دیتے ہیں یا سگریٹ کے دھوئیں کی طرح پھونک دیتے ہیں۔ جب بھی ہم خود کو خالی خالی محسوس کرتے ہیں' فوراً ہی سگریٹ سلگانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پان سگریٹ نہ ہو تو تب بھی کچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کبھی ناداشتگی میں مٹھیاں بھینچتے ہیں یا انگلیوں سے کھیلتے ہیں یا خواہ مخواہ ہی صوفے کے ہتھے کو سہلانے لگتے ہیں۔

اچانک خوشبو کا ایک لطیف سا جھونکا آیا۔ ہوا اُس کی آمد کی چغلی کھا رہی تھی۔ خوشبو قریب آتی جا رہی تھی۔ میں گم صم بیٹھا رہا۔ چہرے سے ناراضگی ظاہر کرتا رہا پھر وہ صوفے کے پیچھے' بالکل قریب آگئی۔ میں نے اس کی چوڑیوں کی آواز سنی پھر اُس کی نازک ہتھیلیاں میرے دونوں شانوں پر آکر ٹھہر گئیں۔ اس نے سُریلے لہجے میں پوچھا۔

"آپ ناراض ہیں؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ گھوم کر میرے سامنے آگئی اور میرا چہرہ دیکھتے ہوئی اپنائیت سے پوچھنے لگی۔ "یہ کیا؟ آج آپ نے شیو نہیں کیا۔ آدمی کو خود سے اتنا بے پروا نہیں رہنا چاہیے۔"

اُس کا لہجہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں زیادہ دیر اس سے روٹھا نہیں رہ سکوں گا۔ یقیناً وہ میرے سامنے کھڑی دل میں اُتر جانے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی مگر میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ اس کی سرگوشی سنائی دی۔



"آپ مجھ سے نہیں بولیں گے؟"

بے اختیار دل اُس کی طرف کھنچنے لگا۔ جی چاہا' اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں مگر میں نے اب بھی ضبط سے کام لیا۔ وہ پھر سرگوشی میں بولی۔ "کیا بہت بُری ہوں؟ کیا آپ مجھے نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے؟"

اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ بے اختیار میری نگاہیں اس کے سراپا پر جاٹکیں۔ میں اب سے پہلے اُسے اپنی کوٹھی پر کام کرنے والی ملازمہ کے روپ میں دیکھتا رہا تھا۔ گھروں میں کام کرنے والیاں میک اپ نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے.......... حالات اُنھیں اپنی زندگی کی سادہ تصویر میں رنگ بھرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اب جو فیروزہ کو حالات نے رنگ بھرنے کی اجازت دی تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

شیمپو سے دُھلے ہوئے بال ریشم کی طرح ملائم ہوگئے تھے۔ ہرنی کی طرح بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھار تھی۔ اس دھار سے آنے والی ہر نظر تلوار تھی۔ چہرہ تھریڈنگ کے بعد خوب نکھر آیا تھا۔ ناک نقشہ پہلے جاذبِ نظر تھا یعنی نظروں کو اپنی ذات میں جذب کرلیتا تھا۔ اب وہ ناک نقشہ دلنشین ہوگیا تھا۔ سیدھا دل میں آکر بیٹھ رہا تھا۔ اُس نے نہایت ہی قیمتی آف وہائٹ کلر کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ خوب صورتی سے تراشا ہوا لباس حسنِ سراپا کی تکمیل کر رہا تھا۔ میں ایک دم سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر ایک ادائے ناز سے گھوم کر جاتے ہوئے کہا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے بے اختیار کہا۔ "ایسی لگ رہی ہو جیسے آگ لگتی ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ میری طرف گھوم کر بولی۔ "آگ جلا ڈالتی ہے۔"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں جل جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کا گھر جلانا نہیں چاہتی۔"

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "فیروزہ!" میرے صبر کو مت آزماؤ۔ یہ کیسی پارسائی اور شرافت ہے کہ میرے گھر میں رہتی ہو' میرا کھاتی ہو' میرا پہنتی ہو اور مجھے ہی تڑپاتی رہتی ہو۔"

"میں یہاں رہنے نہیں آئی' آپ مجھے لائے ہیں۔ میں یہ لباس پہنتی نہ تھی لیکن آپ مجھے ایسے لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں اپنا کماسکتی ہوں' کھاسکتی ہوں لیکن آپ میرے اخراجات برداشت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ میں نے تو کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔"

"بیشک تم نے یہ مطالبہ نہیں کیا۔ میں تمھیں یہ سب کچھ دے رہا ہوں اور بہت کچھ دیتا رہوں گا لیکن یہ تو سوچو کیوں؟"

"سمجھتی ہوں۔"

"کیا خاک سمجھتی ہو؟"

"خاک تو آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کی نظروں میں حسن محض خاک میں ملا دینے کے لیے ہے۔ جہاں کوئی حسین چیز دیکھی' پہلے اُسے بنایا' سنوارا' پھر اس کی پوجا کی' پھر اُسے توڑ پھوڑ کرنابود کردیا۔

میں سیدھی سی بات جانتی ہوں' جس عورت کو بیاہ کرلایا جائے' وہ محبت سے شکست کھاتی ہے۔ ٹوٹتی ہے پھوٹتی ہے' لیکن اپنے بچوں کی ماں بن کر اپنے حسن کو بچوں میں منتقل کردیتی ہے۔ میرے نصیب میں وہ عورت بننا نہیں ہے۔ جب آپ نے مجھے ایک چھوٹی سی جگہ سے اٹھا کر اتنی اُونچی جگہ پہنچادیا تو میری سمجھ میں یہی آیا کہ پھولوں کو باغیچے سے توڑ کرلایا جاتا ہے تو انہیں مسل کر پھینکا نہیں جاتا بلکہ گلدان میں سج جاتا ہے۔ آپ مجھے ایک جگہ سے توڑ کر لائے۔ میں یہاں آپ کے گھر کے گلدانوں میں سج گئی ہوں۔ گلدانوں کے پھولوں کو دور سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ بھی مجھے دور سے دیکھتے رہیں۔"

"کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو؟ کیا میں نے تمھاری ذات پرلاکھوں روپے اس لیے خرچ کیے کہ دور سے ہی دیکھتا رہ جاؤں۔"

"آپ کی طرح میں بھی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے اور یہ دل کسی جیون ساتھی کے لیے دھڑکتا ہے۔ وہ جیون ساتھی آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا' لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں کسی عورت کا حق نہیں مارسکتی۔ میں اللہ سے ڈرتی ہوں۔"

"تمھاری یہ باتیں مجھے بھڑکا رہی ہیں کہ میں واجدہ کو قتل کر کے تمہیں ہمیشہ کے



لیے اپنالوں۔"

"آپ جس دن ایسا کریں گے' اس دن آپ کو آئیڈیل بنانے کے باوجود پھانسی کے تختے تک پہنچادوں گی۔"

میں نے بے بسی سے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے اسے دیکھا' پھر پوچھا۔ "وہ کیسٹ کہاں ہے؟"

"جہاں بھی ہے' محفوظ ہے۔ آپ وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔"

میں نے غصے اور نفرت سے کہا۔ "ابھی تمھیں قتل کردوں تو جانتی ہو کیا ہوگا۔ وہ کیسٹ جہاں چھپا ہوا ہے' چھپا ہی رہ جائے گا۔ میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

وہ نہایت اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وہ بنک کے ایک لاکر میں ہے' لاکر حاصل کرنے کے قانونی کاغذات کے ساتھ میری ایک درخواست منسلک ہے' اس درخواست میں لکھا ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو میرے بعد اس لاکر کو پولیس کا کوئی ذمے دار افسر ہی کھول سکتا ہے۔"

میں جھاگ کی طرح اس کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا' پاس بیٹھنے پر وہ اعتراض کرے گی لیکن اس نے اور پاس ہو کر پوچھا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں نے فوراً پرے ہٹ کر کہا۔ "اچھی لگ رہی ہو مگر دور سے۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "ایسی دوری بھی ضروری نہیں ہے۔ صرف بچوں کی طرح سمجھانا چاہتی ہوں کہ تصویر کو چھونا چاہیے' میلا نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے ناگواری سے پوچھا۔ "تم کب تک پارسا بنی رہوگی۔ کیا کسی سے شادی بھی نہیں کروگی؟"

"میں نے اپنے خیالوں میں' خوابوں مین' دل کی گہرائیوں میں تم سے شادی کرلی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن میں اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ کسی کا گھر تباہ نہیں کرنا چاہیے۔"

اچانک مجھے ایک تدبیر سوجھی' میں نے سوچا۔ اسے بہلانا چاہیے۔ شاید کسی طرح وہ کیسٹ میرے ہاتھ لگ جائے۔ میں نے کہا۔ "تم نے اعتراف کیا ہے کہ مجھے دل کی

گہرائیوں سے اپنا سب کچھ مان چکی ہو۔ رکاوٹ صرف تمہارے اپنے مزاج کی اور اپنے نظریے کی ہے۔ تم کسی کا گھر تباہ کرنا نہیں چاہتیں' لیکن اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی بھی اجازت ہے' اگر آدمی تمام بیویوں کے ساتھ انصاف قائم رکھ سکے اور میری بیوی تو بالکل معذور اور اپاہج ہے۔ ایسی صورت میں مجھے تم سے نکاح کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔"

اس کا چہرہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا' بات سنتے ہی چہرے پر اور تازگی آگئی۔ وہ اپنی شادی کی بات پر کیسے خوش نہ ہوتی حالانکہ فون پر بڑے ہی جوش و خروش سے کہا تھا کہ کسی عورت کا حق نہیں مارنا چاہتی لیکن دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنے والے کوئی مناسب راستہ اختیار کر کے اپنے حقوق بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھی' اب سمجھ رہا تھا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فیروزہ! واقعی تم ایک باضمیر عورت ہو۔ تم نے میرے ضمیر کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں' آئندہ واجدہ کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سوچوں گا۔ اس کے ساتھ ایک شوہر کے فرائض ادا کرتا رہوں گا۔ ہم واجدہ کی دنیا سے الگ تھلگ اپنی ایک الگ دنیا آباد کر سکتے ہیں۔ ایسے قانونی اور جائز راستے پر چل کر تو تم میری بن سکتی ہو؟"

اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ شرما رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک انگلی سے دھکا دیا تھا۔ اب میں نے بھی ایک ہی انگلی اس عورت کی ایسی رگ پر رکھی تھی۔ جس کے بعد وہ پھڑپھڑاتی ہے پھر اسے سہاگن بن کر ہی آرام آتا ہے۔ میں نے ایک جائز اور معقول راستہ دکھایا تھا اور وہ سر جھکا کر اُسے خاموشی سے تسلیم کر رہی تھی۔

میں نے اس پتھر کو کسی طرح موم ہی کر دیا۔ اب مسئلہ خود میرا تھا کہ میں اپنی بیوی اور ساس کی لاعلمی میں کس طرح دوسری شادی کر سکتا ہوں۔ اُن کے علم میں لاکر ایسا کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ قانونی طور پر میں ایسا کر سکتا تھا لیکن میری ساس اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

"دیکھو فیروزہ! تم مجھے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتیں' یہ درست ہے نا؟" میں نے نرمی سے کہا۔



"آپ کی ذات کو نقصان پہنچے گا تو میرا ہی نقصان ہوگا۔ میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم جانتی ہو' میری ساس کتنی سخت قسم کی عورت ہے۔ اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ وہ میری جان کی' میری عزت کی اور میرے کاروبار کی دشمن بن سکتی ہے اور مجھے اتنا نقصان پہنچا سکتی ہے جس کے متعلق ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"یعنی آپ خفیہ شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں' تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا باقاعدہ نکاح ہوگا۔ تمہارے پاس ثبوت کے طور پر نکاح نامہ ہوگا۔ تمہیں میری شریکِ حیات کی حیثیت حاصل ہوگی۔ میری کمائی میں' میری دولت اور جائداد میں تمہارا حصہ ہوگا۔ میری عزت تمہاری عزت ہوگی۔ کبھی موقع آئے گا تو میں اعلانیہ دنیا والوں کے سامنے تمہیں اپنی بیوی کہوں گا۔"

"یہ خفیہ شادی کب تک چھپی رہے گی۔ جب آپ کی ساس کو پتا چلے گا تب کیا ہوگا؟"

"تب تو مجبوراً حالات کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔ تم اس بات کی فکر کیوں کرتی ہو۔ تم تو باقاعدہ میری شریکِ حیات رہو گی۔ ان کی مخالفت سے ہمارا نکاح نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ خواہ کتنا ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں' تم میری بیوی ہی رہو گی۔"

وہ سر جھکا کر میری باتوں پر غور کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ خفیہ شادی تمہیں منظور ہے جبکہ تمہیں ہر طرح تحفظ حاصل ہو رہا ہے۔"

اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مجھے تسلیم کرنا پڑا' اُسے نکاح میں لانا ہی پڑے گا۔ اس رات میں اپنی کوٹھی میں آگیا۔ فیروزہ کے پاس رہنے کا مطلب یہ ہوتا کہ مجھے کانٹوں کے بستر پر رات گزارنا پڑتی اور یہ اچھا ہی ہوا کہ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے قریب رہنے سے جذباتی طور پر اس سے نکاح پڑھانے کے متعلق ہی سوچتا رہتا جبکہ اس سے دور ہو کر ہر اچھے بُرے پہلو پر غور کر رہا تھا۔ دماغ یہی سمجھا رہا تھا کہ شادی نہ کرنے پر وہ تنگی کا ناچ نچا رہی ہے' بیوی بننے کے بعد اور کیا قیامت ڈھائے گی؟

دوسرے دن میں فیروزہ کے پاس پہنچا تو کوٹھی کے برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کار سے اتر کر پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

وہ دور ہی سے میری بلائیں لیتے ہوئے بولی۔ "اے بیٹا! میں تمھاری بہت کچھ ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتے مگر میں پہچان گئی ہوں۔ تم میرے داماد ہو۔"

"کیا؟" میرے حلق سے چیخ نکلی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ دوسری ساس کہاں سے آگئی؟ فیروزہ نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ.......... ذرا سا ہٹا کر کہا۔ "یہ میری وہی دشمن ماں ہیں جنھوں نے مجھے بچپن میں چھوڑ دیا تھا۔ میں ابھی بنک سے واپس آرہی تھی، پتا نہیں انھوں نے مجھے کیسے دیکھ لیا۔ پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آگئیں۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا ہے۔ یہ بار بار دستک دے رہی ہیں، اندر آنا چاہتی ہیں۔ آپ انھیں سمجھا دیجیے میں ان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ یہ یہاں سے چلی جائیں۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی میری دوسری ناگہانی ساس نے کہا۔ "کیسے چلی جاؤں۔ تجھے کیا معلوم، میں تیرے باپ کا انتقال ہونے کے بعد تیرے لیے کتنی پریشان رہی۔ ان دنوں میں یہاں نہیں تھی، سکھر گئی ہوئی تھی۔ آتے ہی تجھے ڈھونڈنے نکلی۔ جس کوٹھی میں تُو کام کرتی ہے، میں نے وہاں کا پتا بڑی مشکلوں سے حاصل کیا۔ میں وہاں ملنے جارہی تھی کہ بنک کے پاس تُو نظر آگئی۔ بیشک میں نے تیرے باپ کو چھوڑا لیکن اللہ جانتا ہے، تجھے دل سے کبھی نہیں چھوڑا۔ ایک بار مجھے گھر میں آنے دے۔"

"تم جانتی ہو، میں بہت ضدی ہوں۔ یہاں سے چلی جاؤ۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

اس بلائے ناگہانی نے کہا۔ "تُو اگر ضدی ہے تو میں بھی تیری ماں ہوں۔ دیکھتی ہوں، دروازہ کیسے نہیں کھولے گی۔ ارے تیرے ساتھ بات نہیں کرسکتی، تیرے پاس نہیں آسکتی، اپنے داماد کے ساتھ تو رہ سکتی ہوں۔"

یہ کہہ کر فوراً ہی میری طرف پلٹ گئی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے میری کار کے پاس پہنچیں۔ پھر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئیں۔ میں دوڑتا ہوا آیا۔ پھر ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیا حرکت ہے۔ آپ یہاں کیوں بیٹھ گئی ہیں؟"



اُنھوں نے کار کی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے ڈائن سمجھتی ہے۔ تم تو جانتے ہو بیٹا! ڈائن سب کو کھاتی ہے مگر داماد کو چھوڑ دیتی ہے۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت سیدھی عورت ہوں۔"

"یہ تو میں دیکھ رہا ہوں، مگر۔ مگر.........."

میں بات ادھوری چھوڑ کر دوڑتا ہوا کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر فیروزہ سے کہا۔ "یہ کیا مصیبت ہے۔ خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔ اگر یہ محترمہ میرے ساتھ کار میں بیٹھ کر اس کوٹھی میں جائیں گی تو دو ساسوں کے درمیان فری اسٹائل ہوگی، اس کے نتیجے میں اکلوتا داماد مارا جائے گا۔"

فیروزہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ محترمہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلیں۔ مجھے دعائیں دینے لگیں۔ "اے بیٹا! میں جانتی تھی، تم ہی میری وکالت کروگے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مکان کے اندر گھس گئیں۔ فیروزہ نے مجھ سے کہا۔ "آیئے۔"

میں نے دونوں کان پکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو معاف کرو۔ میں نے کل تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ فیصلہ واپس لے رہا ہوں۔ تمھاری ماں نے خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ میں اور تم دوست ہی بھلے۔ میں تمھیں دور سے دیکھ کر آہیں بھرلیا کروں گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آیئے تو سہی۔ میں ابھی امی کو بھگا دوں گی۔"

"جب وہ یہاں سے چلی جائیں تو فون کے ذریعے اطلاع دے دینا۔ میں دفتر میں انتظار کروں گا۔"

میں جانے لگا، فیروزہ نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ بُرے وقت میں تنہا چھوڑ کر جارہے ہیں۔ امی بڑی ڈھیٹ ہیں۔ میں تنہا نمٹ نہیں سکوں گی۔ پلیز، آپ میرا ساتھ دیں۔ ہم دونوں مل کر انھیں یہاں سے روانہ کردیں گے۔"

میں نے اُس کے ہاتھوں کو دیکھا جن میں میرا ہاتھ تھا۔ وہ بڑی محبت و اپنائیت سے ساتھ دینے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں انکار نہ کرسکا، اندر آگیا۔ وہ محترمہ ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑی گول گھوم کر دیکھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ "واہ، میری بیٹی کے

نصیب جاگ گئے۔ اللہ جانتا ہے' میں تیرے لیے ایسا ہی بڑا اور ایسا ہی گھر سوچتی تھی۔ یہ رنگین ٹی وی کتنے کا لیا؟"

فیروزہ نے چڑ کر کہا۔ "بڑے گھروں میں قیمتی چیزوں کو حسرت سے دیکھا جاتا ہے' ان کی قیمت نہیں پوچھی جاتی۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "اے بڑا گھر ہوگا دوسروں کے لیے یہ تو میری بیٹی کا ہے' میرا ہے۔"

"میرا ہے' کا کیا مطلب ہوا؟"

"بیٹی کیا بتاؤں۔ تیرے سوتیلے باپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اب اس عمر میں کہاں دھکے کھانے جاؤں گی اور کہیں جانے کی ضرورت بھی کیا ہے' بیٹی کا گھر تو میرا ہی گھر ہوا۔"

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ فیروزہ نے مجھے بے بسی سے دیکھا پھر اپنی ماں سے کہا۔ "آپ یہاں نہیں رہ سکتیں۔"

"اس کمرے میں نہ سہی' دوسرے کمرے میں رہ جاؤں گی۔"

فیروزہ نے غصے سے کہا۔ "آپ اس کوٹھی میں نہیں رہ سکتیں۔"

"اوہ' اچھا سمجھ گئی' ایک ہی بیڈ روم ہے۔ کوئی بات نہیں' میں رات کو برآمدے میں سوجایا کروں گی۔"

میں نے اُنھیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ محترمہ تو کمبل ہیں۔ مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔؟"

"ارے بیٹا! پیچھا چھوڑیں دُشمن' ہم تو اپنے ہیں۔ دُکھ سُکھ میں کام آنے والے۔ میری بچی! شادی کر لینے سے گھر سنبھالنا نہیں آجاتا۔ آج تم ایک سے دو ہوئی ہو۔ کل دو سے تین ہوگی۔ اس ننھی سی جان کو کون سنبھالے گا۔ آخر نانی ہی سنبھالتی ہے نا؟"

"اوہ امی پلیز' اپنی زبان بند رکھیں۔ ابھی تو ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"کیا؟" محترمہ نے چونک کر ایک بار مجھے پھر دوسری بار بیٹی کو دیکھا۔ اس کے بعد غصے سے بولیں۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ابھی شادی نہیں ہوئی ہے؟"

"ہاں' نہیں ہوئی۔"



"پھر تم اس گھر میں کیسے رہتی ہو؟"

"جیسے آپ دیکھ رہی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' تم نے اپنی عزت' اپنی شرم' اپنی غیرت اس دولت مند کے ہاتھ بیچ دی ہے۔؟"

"امی' خبردار' آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ میں آپ کی طرح نہیں ہوں۔ میں بیشک اس گھر میں رہتی ہوں مگر عزت سے رہتی ہوں۔"

اس کی ماں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اری جا' کل کی دودھ پیتی بچی' مجھے سمجھا رہی ہے۔ اگر اتنی ہمت ہے تو اس گھر سے نکل کر دنیا والوں کو سمجھا۔ اُنھیں یقین دلا کہ تُو اس دولت مند کی کوٹھی میں عزت آبرو سے رہ رہی ہے۔"

اچانک ہی فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کی ماں نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "کیوں میاں صاحبزادے! یہ کیا قصہ ہے۔ تم نے کس رشتے سے میری بیٹی کو یہاں رکھا ہے؟"

میں نے پریشان ہوگیا۔ مجھے یقین تھا دنیا والے ہمارے معاملے میں نہیں پڑیں گے۔ قانون ہمارے گھر میں جھانکنے نہیں آئے گا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ ناگہانی بلا ہمارا محاسبہ کرنے پہنچ جائے گی۔

وہ ایک صوفے پر چڑھ کر ساری سمٹتی ہوئی اکڑوں بیٹھ گئیں۔ پھر کہنے لگیں۔ "میں سیدھے کے ساتھ سیدھی اور ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھی ہوں۔ میرا فیصلہ سُن لو۔ جب تک تم دونوں کا نکاح نہیں ہوجائے گا' اس وقت تک اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔ لہٰذا صاحبزادے! تم ابھی یہاں سے جاؤ۔ جب نکاح کی تیاری کرلو' بارات لے کر آؤ تو گھر کے دروازے کھلیں گے۔ اگر اس کوٹھی پر مالکانہ حقوق کا دعویٰ کرو گے تو میں اپنی بیٹی کو لے کر چلی جاؤں گی۔ جب فیروزہ کی ضرورت ہوگی تو میرے پاس چلے آنا۔ میں اپنا اور اپنی بیٹی کا کہیں ٹھکانہ بنالوں گی۔"

میں وہاں سے چلا آیا۔ فیروزہ نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ حالات کو سمجھ رہی تھی اور حالات کے مطابق شاید اپنی ماں سے سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے اُس کے حال پر

چھوڑ دیا اور دفتر پہنچ کر شام چھ بجے تک فون کا انتظار کرتا رہا۔ آخر میں نے ہی ریسیور اٹھا کر اس سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے بجائے اس ناگہانی بلا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "ریسیور اپنی بیٹی کو دیجئے۔"

"تم میری بیٹی سے باتیں کرنے والے کون ہو؟"

اس کے ساتھ ہی فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ "امی ریسیور مجھے دیجئے۔ خواہ مخواہ بحث کرنے لگتی ہیں۔"

پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہیلو' آپ جب سے گئے ہیں' میں فون کرنے کے متعلق سوچ رہی ہوں مگر امی نے میرا بھیجا ہلا کر رکھ دیا ہے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "مجھے یقین ہے' تمہاری امی بھیجا ہلانے کی ماہر ہیں۔ اللہ کا شکر ہے' میں اپنی جان بچا کر چلا آیا۔"

"آپ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ امی کے ہوتے ہوئے آپ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ وہ تو آپ کی کوٹھی تک پہنچنا چاہتی ہیں۔ آپ کی بیگم اور ساس سے شکایت کرنا چاہتی ہیں۔ وہ صرف کوٹھی تک ہی نہیں' عدالت تک بھی پہنچ سکتی ہیں۔ آپ نہیں جانتے' یہ کتنی خطرناک ہیں۔"

مجھے اُسی ریسیور سے اُن کی آواز سنائی دی۔ "اے بیٹی! میں تجھے قابو میں رکھنے اور عزت و آبرو سے زندگی گزارنے کے گُر سکھا رہی ہوں اور تُو مجھے خطرناک کہہ رہی ہے؟"

فیروزہ نے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ پریشان نہ ہوں۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گی۔ فی الحال آپ دفتر میں نہ بیٹھیں' گھر جا کر آرام کریں۔"

میں نے کہا۔ "آدھی رات کے بعد جب میری بیوی اور ساس صاحبہ گہری نیند میں ہوں گی تو ڈرائنگ روم میں آؤں گا اور چپکے سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کروں گا۔ کیا تم اس وقت تک جاگتی رہو گی؟"

"آج تو سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"



پھر اُن کی آواز سنائی دی۔ "میری بچی میں تجھے تھپک تھپک کر سُلا دوں گی۔"

"بس کیجئے' امی! آپ کسی کی قبر میں گھسیں گی تو مُردہ بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے گا۔"

میں نے فیروزہ کو اللہ حافظ کہا اور ریسیور رکھ کر دفتر سے نکل آیا۔ واجدہ اور میری ساس اُوپری منزل میں رہتی تھیں وہیں سوتی تھیں۔ نچلی منزل میں میرا بیڈ روم تھا۔ میں آدھی رات کے بعد ڈرائنگ روم سے ٹیلیفون اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ دروازے کو بند کیا پھر رابطہ قائم کر کے فیروزہ کو مخاطب کیا۔

"کیا تمھاری امی چلی گئیں؟"

"نہیں۔"

"کیا سو رہی ہیں؟"

"ہم یہ بھول گئے تھے کہ صرف ہم ہی نہیں' وہ بھی ہمارے ساتھ جاگتی رہیں گی۔"

"اوہ گاڈ' کس طرح اُن سے پیچھا چھوٹے گا؟"

فیروزہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں' ان کی موجودگی میرے لیے بہتر ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"دیکھیے نا' میں اس دُنیا میں بالکل تنہا ہوں' میرے سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہیں ہے۔ اچھے بُرے کی پہچان کرانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔ مانتی ہوں کہ میری ماں نے بچپن ہی میں مجھے چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ میرے پیچھے برابر دوڑتی رہی ہیں۔ ایک عورت خواہ کتنی ہی سنگدل ہو' ممتا سے بالکل خالی نہیں ہوئی۔"

"تمھارا ارادہ کیا ہے؟"

"جب تک ہماری شادی نہ ہو جائے' امی میرے ساتھ رہیں گی۔"

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر آپ مجھ سے نکاح کر لیجئے۔ میں امی کو یہاں رُخصت کر دوں گی۔"

"ایک تو میں دوسری شادی کے سخت خلاف ہوں۔ سوچ رہا تھا' اس کوٹھی میں تمھاری ہر ضرورت پوری کرتا رہوں اور تم میری ہر بات مانتی رہو۔ ہماری زندگی گزر

جائے گی لیکن تم نے ایک کیسٹ کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنا شروع کیا۔ میں دوسری شادی کے لیے راضی ہوگیا لیکن اس دوسری شادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں دوسری ساس کو بھی برداشت کرلوں۔ یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں اسی شرط پر شادی کروں گا کہ تمہاری ماں ہمیشہ کے لیے چلی جائے اور پھر کبھی تمہاری طرف رُخ نہ کرے۔"

"آپ اپنے مطلب سے' اپنے نکتہ نظر سے بات کرتے ہیں' میں بھی اپنے نکتہ نظر کو سمجھنے لگی ہوں۔ امی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں تھی کہ جب آپ سے نکاح ہوگا تو میری طرف سے کوئی بزرگ نہیں ہوگا۔ امی آگئی ہیں تو کیا میں اس بزرگ ہستی کو یہاں سے بھگادوں۔ کیوں بھگادوں؟ کیا آپ مجھ سے قانونی نکاح نہیں کرنا چاہتے' کوئی فراڈ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر نہیں کرنا چاہتے تو امی کی موجودگی پر کیوں اعتراض کر رہے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کر رہی ہوں' شادی کے بعد وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گی۔"

"میں کسی وعدے کے سہارے ایک ساس کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"وہ یہاں سے میری شادی کے بعد ضرور چلی جائیں گی۔"

"تم بھی اپنی ماں کے ساتھ وہاں سے نکل جاؤ۔ جب تم ہمیشہ کے لیے چلی جاؤگی' میرا تمہارا کوئی لین دین نہیں رہے گا تو وہ کیسٹ مجھے دے دینا۔ میں اپنی زندگی کسی طرح گزار لوں گا۔ اپنی بیوی واجدہ کا دوست بن کے رہوں یا دشمن' تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں' اس کیسٹ سے اپنا کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتی۔ وہ واجدہ کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ آپ اس کیسٹ کا خیال دل سے نکال دیں۔"

اس کی امی کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی! یہ بار بار کس کیسٹ کا ذکر ہو رہا ہے۔ یقیناً کوئی اہم کیسٹ ہے۔ تم نے اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"امی چپ رہیے۔ مجھے باتیں کرنے دیجیے۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "باتیں کیا خاک کروں گا۔ تمہاری ماں تمہیں میرے خلاف سبق پڑھا رہی ہے۔ میں صبح تک تمہیں موقع دیتا ہوں' کوئی سمجھوتے کا راستہ نکالو ورنہ



ہم دونوں تباہ ہوجائیں گے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ٹیلیفون کو اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اب میری نیند اُڑ گئی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ بار بار کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی۔ آخر مجھے دو خواب آور گولیاں کھانا پڑیں۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسری صبح نو بجے میری آنکھ کھلی۔ وہ بھی میری ساس دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ "کیا بات ہے' ابھی تک سو رہے ہو۔ ابھی سائیٹ آفس سے فون آیا تھا۔ تمہارا ایک مزدور پچھلی رات کام کرنے کے دوران زخمی ہوگیا ہے۔ تمہیں وہاں پہنچنا چاہیے۔"

میں بستر سے اُٹھ گیا۔ پہلے تو فیروزہ سے کسی طرح بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اُمید تھی' وہ کوئی ایسا سمجھوتہ کرے گی کہ میری زندگی سے کم از کم وہ دوسری ساس نکل جائے گی اور وہ کیسٹ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا لیکن میں اپنی کوٹھی سے فون پر بات نہیں کرسکتا تھا۔ مجبوراً مجھے سائیٹ آفس جانا پڑا۔ وہاں مزدور کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ کام صحیح طور پر چل رہا تھا۔ میں نے وہیں سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی لیکن فیروزہ یا اُس کی امی ریسیور نہیں اٹھا رہی تھیں۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد فون کیا دوسری طرف سے پھر لاتعلقی کا اظہار ہوا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ماتھا ٹھنک رہا تھا' ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے فوراً ہی کار سنبھالی' تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اپنی اس دوسری کوٹھی میں پہنچ گیا۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ دوسری چابی میرے پاس تھی۔ میں نے اُسے کھولا۔ اندر پہنچ کر دیکھا' تمام سامان اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ میری دوسری ہونے والی ساس نے چوری نہ کی ہو اور بہت سامال لے کر فرار ہوگئی ہو۔ بیڈروم میں آیا۔ ٹیلیفون کے نیچے ایک پرچی نظر آرہی تھی۔ میں نے اُسے اٹھا کر پڑھا۔ فیروزہ نے لکھا تھا۔

"آپ میرا انتظار کریں۔ مجھے آنے میں دیر ہوگئی تو کہیں سے فون پر رابطہ کروں

گی۔"

میں نے اس پرچی کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ اُس نے کچھ لکھا ہی نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ کہاں گئی ہے۔ مجھے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کیوں کہا ہے۔ ایسی کیا بات کہ جلد نہیں آسکے گی تو فون پر رابطہ قائم کرے گی۔ مجھے اور بھی کام تھے۔ کب تک اس کے انتظار میں وہاں بیٹھا رہ سکتا تھا۔

میں نے اس پرچی کو ایک طرف پھینک دیا اور کیا کر سکتا تھا۔ وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ نہ بیٹھتا' اس سے رابطہ قائم نہ ہوتا' کچھ معلومات حاصل نہ ہوتیں تو دل میں کھلبلی سی رہتی۔

مجھے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً ہی اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ پردے کو ہٹا کر دیکھا' باہر فیروزہ ٹیکسی سے اترنے کے بعد کرایہ ادا کر رہی تھی۔ میں واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ غصے کا موڈ بنانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر آگئی۔ مجھے وہیں کھڑی رہ کر دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے' اندر کیوں نہیں آتیں؟"

وہ اندر آئی اور سر جھکا کر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے ناگواری سے پوچھا۔ "تم نے ایسا منہ بنا رکھا ہے جیسے تمھاری ماں مرگئی ہو۔"

یک بیک وہ رونے لگی۔ "اچھا ہوتا اگر وہ مرجاتیں۔ انھوں نے تو میرا جینا دوبھر کردیا ہے۔"

"آخر بات کیا ہوئی؟"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے بولی۔ "وہ ہمارا کیسٹ چُرا کر لے گئی ہیں۔"

"کیا؟" میں ایک دم سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "کون سا کیسٹ؟"

"وہی جس میں آپ کی آواز ریکارڈ کی تھی۔"

میں نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ "تم نے تو کہا تھا' اُسے بنک کے لاکر میں رکھا ہے۔"

"میں نے جھوٹ کہا تھا تاکہ آپ میرے کمرے کی تلاشی نہ لیں۔ مجھ جیسی غریب لڑکی نے پہلے کبھی بنک کے دروازے پر قدم نہیں رکھا۔ میں کیا جانوں کہ لاکر کس طرح



حاصل کیے جاتے ہیں۔ البتہ معلومات حاصل کرنے کے لیے بنک گئی تھی' واپسی میں امی کو پیچھے لگا کر لے آئی۔"

میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "میں پوچھتا ہوں' وہ کیسٹ لے کر کہاں گئی ہیں؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ اگر وہ پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں گی یا اس کیسٹ کے سلسلے میں کسی اور کو اپنا رازدار بنائیں گی تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

"یہ ہم والا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہو؟ تمھارا کیا بگڑے گا۔ قانون کی گرفت میں تو میں آؤں گا۔ تم خوشیاں مناؤ۔ ایک تو مجھے اُلو بنایا' لاکھوں روپے کی اس کوٹھی میں آکر رہنے لگیں' ہزاروں کی شاپنگ کی' عیش و آرام سے رہ رہی ہو اور اس کا صلہ تم نے مجھے یہ دیا ہے۔"

"آپ مجھے کیوں الزام دے رہے ہیں۔ کیا میں آپ کا کبھی نقصان کر سکتی ہوں۔ کبھی آپ پر کوئی آنچ آنے دے سکتی ہوں۔ آپ یقین کریں' میں اُنھیں دن رات تلاش کروں گی۔ ان سے کسی نہ کسی طرح کیسٹ چھین کر ضرور لاؤں گی۔"

"اُس وقت تک قانون کے ہاتھ میری گردن تک پہنچ جائیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے غصے سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اب آنسو کیا بہا رہی ہو۔ تم عورتوں کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ مردوں کے خلاف قدم اٹھانے اور چالاکیاں دکھانے کے دوران حماقتیں ضرور کرتی ہو۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔ سچ مچ بڑی حماقت ہوئی ہے مگر میں اس کی تلافی کردوں گی۔"

"کیا خاک کروگی تلافی۔ اگر اس کیسٹ کی بھنک میری ساس کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ مجھے عدالت تک اس طرح گھسیٹیں گی جس طرح میونسپلٹی والے مرے ہوئے کتے کو گھسیٹتے ہیں۔"

میں نے اس کا بازو پکڑ کر صوفے کی طرف گھسیٹا۔ وہ سہم کر بولی۔ "یہ کیا' مجھے چھوڑ دیجیے۔"

اس نے جھٹکا دے کر بازو چھڑا لیا اور پیچھے ہٹ کر بولی۔ "آپ سمجھتے ہیں' میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہو کر آپ کی ہر جائز یا ناجائز بات تسلیم کرلوں گی۔ اگر آپ دوست بن کر میرا ہاتھ پکڑنا چاہتے ہیں تو یہ لیجیے' میں خود اپنا ہاتھ بڑھاتی ہوں لیکن آپ کا ہاتھ میری عزت کی طرف بڑھے گا تو میں امی کا ساتھ دوں گی۔ مجھے یقین ہے' وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں گی۔ پھر میں اُن سے کہوں گی' اگر اُنھوں نے وہ کیسٹ پولیس والوں کے حوالے نہیں کیا ہے تو اب کردیں۔"

مجھ پر جنون سوار ہوگیا۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "ہاں' جاؤ پولیس والوں کے پاس جاؤ۔ میری ساس کے پاس جاؤ۔ مجھے ہر طرح سے تباہ کردو۔ تمھارے جیسی احسان فراموش لڑکیاں اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔"

"بہت خوب' تمھاری ناجائز بات کو تسلیم نہ کیا جائے تو احسان فراموشی ہوجاتی ہے۔ کیا رونے' چیخنے یا غصہ دکھانے سے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔ جو ہو رہا ہے' اس پر صبر کرنا ہوگا اور امی کو تلاش کرنا ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ اس سے زیادہ میں آپ کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتی۔"

میں کھڑا سوچتا رہا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھی سر تھامے سوچ رہی تھی۔ میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر آہستگی سے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ امی کتنی بڑی فنکار ہیں۔ کل آپ کے جاتے ہی جانے کیسا میٹھا زہر بن کر میری رگ رگ میں سماگئی تھیں۔ جب آپ نے آدھی رات کے بعد کیسٹ کا بار بار ذکر کیا تو وہ میرے پیچھے پڑگئیں۔ پہلے تو میں نے ٹالنے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ اُنھوں نے مجھ سے ایسی ممتا جتائی کہ میں اُن کے سینے سے لگ گئی۔ ان کے سینے سے لگ کر میرے جذبات کیا تھے' یہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ پہلی بار مجھے خیال آیا' اگر میں اپنی ماں پر بھروسہ نہیں کروں گی تو کسی اور پر بھی نہیں کرسکوں گی۔"

میں نے ناگواری پوچھا۔ "اور تم نے وہ کیسٹ ماں کے حوالے کردیا۔"

"نہیں' میں نے صرف وہ کیسٹ اُنھیں سنایا تھا۔ وہ مجھے سمجھانے لگیں' اس کیسٹ



کے ذریعے میں آپ کو بلیک میل کر کے فوراً آپ کی دُلہن بن سکتی ہوں۔ میں نے اعتراض کیا۔ اُنھیں بھی وہی بات سمجھائی جو آپ سے کہہ چکی ہوں۔ یعنی میں جبراً شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ راضی خوشی کا سودا ہے۔"

اُنھوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے' تمھاری جو مرضی۔ جو میری بیٹی چاہے گی وہی میں کروں گی۔ میں نے اُن کے سامنے وہ کیسٹ الماری کی دراز میں رکھ دیا۔ صبح چار بجے تک وہ مجھ سے اتنی محبت اور ممتا سے پیش آتی رہیں کہ میں اُن کی آغوش میں سوگئی۔ میں گہری نیند میں تھی۔ مجھے کچھ پتا ہی نہ چلا' صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے الماری پر نظر گئی۔ اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں فوراً ہی اُٹھ کر وہاں پہنچی۔ دراز بھی ذرا کُھلی ہوئی تھی۔ زیورات کے سیٹ وغیرہ موجود تھے۔ صرف کیسٹ غائب تھا۔"

"اُسے زیورات لے جانے کی کیا ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ ایک کیسٹ کے ذریعے بلیک میل کر کے زیورات کی دُکان کھول سکتی ہے۔"

وہ صوفے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "میری امی چور نہیں ہیں۔"

"تو کیسٹ کیوں چُرایا؟"

"وہ ابتدا ہی سے زندگی گزارنے اور مستقبل سنوارنے کے غلط راستوں پر چلتی آئی ہیں۔ میرے لیے بھی یہی چاہتی ہیں کہ کیسٹ کے ذریعے بلیک میل کر کے مجھے آپ کی دُلہن بنا دیں۔ حالاں کہ میں نے بار بار اعتراض کیا ہے۔ وہ سمجھ گئی ہیں کہ میں اُن کی بات نہیں مانوں گی۔ آپ دیکھیے گا اب وہ آپ کو مجبور کریں گی۔ آپ پر دباؤ ڈالیں گی کہ مجھ سے فوراً ہی شادی کرلیں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ شام کو جب میں دفتر میں جاکر بیٹھا تو فون کے ذریعے محترمہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی سخت لہجے میں کہا۔ "آپ کو بیٹی کے گھر سے چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ یہ کیا چھچھوری حرکت ہے؟"

"بیٹے! چھچھوری حرکت وہ ہے جو تم کر رہے ہو۔ ایک نادان لڑکی کو اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا ہے اور اس سے شادی بھی نہیں کرتے ہو۔"

"آپ فضول باتیں نہ کریں۔ وہ کیسٹ واپس کریں۔"

"کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے' آپ اُسے قانون کے حوالے کریں گی۔"

"برخوردار! میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اتنی نادان نہیں ہوں کہ اپنی نادان بچی کے ہونے والے شوہر کو کسی مصیبت میں مبتلا کروں۔ پہلے تو محبت سے سمجھا رہی ہوں۔ نہیں سمجھو گے' میری باتوں پر عمل نہیں کرو گے تو اس کیسٹ کی ایک ڈپلی کیٹ تمھاری ساس کے پاس پہنچادوں گی۔ بس وہی تمھارے لیے کافی ہے۔ بے چارہ قانون تمھارا کیا بگاڑے گا؟"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم نہیں آپ۔ میں تمھاری ہونے والی ساس ہوں۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"چوبیس گھنٹے سے پہلے میری بیٹی سے نکاح کرلو۔ دو دن کے بعد میں نکاح نامے کی ایک نقل چاہتی ہوں۔ اس کے ذریعے تصدیق کروں گی' واقعی وہ نکاح قانونی ہے یا نہیں؟"

"کیا نکاح کے بعد آپ وہ کیسٹ واپس کردیں گی؟"

"کیا میری بیٹی کو شریکِ حیات بنانے کے بعد تم ڈیفنس والی کوٹھی اُس کے نام کردو گے؟"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں واجدہ اور میری ساس رہتی ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کوٹھی تو تمھارے نام ہے۔ تم اسے میری فیروزہ کے نام کرسکتے ہو۔"

"آپ مجھے مشکلات میں ڈال رہی ہیں۔"

"کوئی مشکل والی بات نہیں ہے۔ چپ چاپ اُس کوٹھی کے کاغذات میری بیٹی کے نام کردو۔ جب تک واجدہ اور اُس کی ماں وہاں رہیں گی' میری بیٹی اس کوٹھی کے مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کرے گی۔"



"وہ کوٹھی کیا ضروری ہے' جس میں ابھی فیروزہ رہتی ہے' میں اُسے اُس کے نام کروں گا۔"

"میں گھاٹے کا سودا نہیں کرتی۔ وہ چھوٹی سی کوٹھی تم واجدہ کے نام کرسکتے ہو۔"

"آپ کی شرط ناقابلِ عمل ہے۔ پھر بھی کوشش کروں گا۔ کیا ڈیفنس والی کوٹھی فیروزہ کے نام ہونے کے بعد وہ کیسٹ واپس کریں گے۔"

"اس کے بعد بھی دو شرائط ہیں۔ اوّل تو یہ کہ شادی کے فوراً بعد میری بیٹی کے نام دس لاکھ روپے کا بیمہ کراؤ۔"

"اتنی بڑی رقم۔"

"تمھیں کون سی نقد رقم ادا کرنا ہوگی۔ اپنی زندگی کا بیمہ کراؤ اور کاغذات پر دس لاکھ کی حقدار صرف فیروزہ کو قرار دو۔ تمھاری بیمہ پالیسی کے کاغذات پر صرف فیروزہ کا نام ہونا چاہیے۔"

"بہرحال یہ آسان طریقہ ہے۔ میں پالیسی لے لوں گا۔ دوسری شرط کیا ہے؟"

"جس دن تم پانچ لاکھ روپے میری بیٹی کے اکاؤنٹ میں جمع کردو گے' وہ کیسٹ تمھیں مل جائے گا۔"

"میرے پاس پانچ لاکھ روپے نہیں ہیں۔"

"نہیں ہیں تو ہوجائیں گے' جلدی کیا ہے؟"

"مجھے اس کیسٹ کو حاصل کرنے کی جلدی ہے۔"

"تو پھر وہ مطلوبہ رقم اکاؤنٹ میں جمع کردو۔"

میں نے غصّے سے جھنجلا کر کہا۔ "اور بھی کوئی شرط ہو تو بیان کردیں۔"

"اور ایک اہم شرط ہے۔ ہمارے درمیان جو معاملات طے ہو رہے ہیں' اس کا علم فیروزہ کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں نہیں ہونا چاہیے؟"

"میں اُس لڑکی کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ تم پر دباؤ ڈالا جائے۔"

"کیا میں اُسے یہ بھی نہ بتاؤں کہ تم نے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا تھا؟"

"تم نہیں، آپ۔"

"سوری، آپ۔"

"ہاں اُسے یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "اگر فیروزہ نے شادی سے انکار کیا یا میں اُسے جو کچھ دینا چاہوں، اُسے قبول کرنے سے انکار کیا تو؟"

"میرے دودھ پیتے بچے! مجھے بتانے کی کوشش نہ کرو۔ فیروزہ اسی وقت انکار کرے گی جب اُسے معلوم ہوگا کہ اُس کی ماں تم پر ناجائز دباؤ ڈال رہی ہے۔ جب تم اس سے ذکر نہیں کروگے اور یہ تاثر دوگے کہ راضی خوشی اپنی محبت سے اس کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہو تو عورت ایسے میں اپنے مرد پر قربان ہوتی رہتی ہے اور اُس کی ہر دین کو اپنا مقدر سمجھ کر خوشی سے قبول کرتی رہتی ہے۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔ یاد رکھو، چوبیس گھنٹے کے اندر ضرور نکاح پڑھوالینا۔ میں ٹھیک چار دن بعد تمھارے دفتر آؤں گی اور اس نکاح نامے کی نقل لے جاؤں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا، مجھے سوچنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب میں فیروزہ سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی ماں مجھے کس طرح بلیک میل کر رہی ہے۔ پہلے تو فیروزہ پر غصہ آرہا تھا لیکن وہ بلیک میلر بہت اچھی تھی، اس نے مجھے راہِ راست پر لانے کے لیے کیسٹ کو محفوظ رکھا تھا۔ اب میرے دل نے کہا، فیروزہ نہ تو پہلے لالچی تھی نہ اب ہے۔ وہ اپنی ماں کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی کسی بات پر عمل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس کمبخت ہونے والی ساس نے اس طرح میرے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔ ایک طرف مجھے بلیک میل کر رہی تھی، دوسری طرف بیٹی کو اس سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی۔ عجیب عورت تھی۔

یوں تو میں اس ہونے والی ساس اور اُس کی بیٹی سے بہ آسانی نجات حال کر سکتا تھا۔ اگر میں ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے عدالت میں یہ بیان دے دیتا کہ میں نے غصے کی حالت میں اپنی بیوی واجدہ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا



تھا۔ یہ کبھی میرے لیے قابلِ عمل نہ ہوتا لیکن اس منصوبے کو ایک لڑکی اور اس کی ماں نے ریکارڈ کرلیا اور اس کے ذریعے مجھے بلیک میل کر رہے ہیں۔ میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا لہٰذا مجھے قانون سے ملنے والی سزا منظور ہے۔

اس طرح مجھے کچھ زیادہ سزا نہ ہوتی۔ میں جلد ہی قانون کی گرفت سے رہا ہو جاتا لیکن ساری عمر اپنی پہلی ساس کے طعنے سنتا رہتا کہ میں نے اس کی بیٹی کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور میں اس ساس کی ایک بات بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی تو آواز سنتے ہی میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ایک شریکِ حیات میری ضرورت تھی۔ واجدہ میری ازدواجی زندگی میں صرف ایک.......... دیکھنے کی چیز تھی اور مجھے صرف دیکھنا نہیں تھا بلکہ ایک بیوی ایک شریکِ حیات کی ضرورت تھی اور اس کے لیے دوسری شادی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چونکہ بلیک میل کیا جارہا تھا، اس کیسٹ کو واپس حاصل کرنا چاہتا تھا، فیروزہ دل اور دماغ پر چھائی ہوئی تھی لہٰذا میں اسے اپنے نکاح میں لانے پر مجبور ہوگیا۔

میرا یہ فیصلہ غلط ہو سکتا تھا لیکن جن ذہنی الجھنوں میں مبتلا تھا اور جس طرح مجبور ہو کر رہ گیا تھا، ایسی حالت میں اس سے بہتر کوئی فیصلہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ بہرحال فیصلہ ہوگیا۔ دوسرے دن وہ میری دُلہن بن گئی۔

پہلے میں اُسے نفرت سے کلوٹی کہتا تھا، اب نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ محبت کی نظر سے دیکھ رہا تھا وہ حقیقتاً سانولی سلونی تھی.......... اُسے دیکھ کر تسلیم کرنا پڑا کہ سانولی لڑکیاں دُلہن بن کر غضب ڈھانے لگتی ہیں۔ اس نے بھی بڑا غضب ڈھایا۔ پہلے تو اس نے اتنی بینائی چھین لی کہ میں دنیا کو نہ دیکھ سکوں۔ اتنی بینائی رہنے دی کہ اُسے دیکھتا رہوں۔ دل پر ایسا سِکّہ جمایا کہ دل کی دھڑکن سِکّے کی طرح اسی کے نام پر خرچ ہوتی رہی۔ یہ سوچنے اور انصاف کرنے کی بات تھی۔ واجدہ کے دل میں انصاف ہوتا تو وہ سوچتی کہ اس نے اب تک مجھے اپنے بندھن میں باندھ کر کتنی ناانصافی کی ہے اور فیروزہ تو ایسی دل والی تھی کہ واجدہ سے بھی انصاف کر رہی تھی اور مجھ سے بھی۔

میں نے دو دنوں کی فرصت حاصل کرلی تھی۔ واجدہ اور اپنی ساس کو کہہ دیا تھا کہ

کم از کم تین دن کے لیے سکھر جا رہا ہوں۔ اپنے باس کنور آفتاب خلجی سے بھی یہی کہا تھا۔ کام تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ خلجی صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

تیسرے دن جب میں فیروزہ کے سحر سے نکل کر دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تو یاد آیا کہ دنیا اتنی بڑی ہے اور میں اتنی بڑی دنیا کو بالکل ہی بھلا چکا تھا۔ پھر بھی تیسرے دن دفتر میں زیادہ نہ بیٹھ سکا۔ شام سے پہلے ہی پھر فیروزہ کے پاس چلا آیا۔ پہلی بیوی کی طرف سے ابھی کوئی اندیشہ نہیں تھا کیونکہ میں سکھر جانے والی بات تین دن کے لیے کہہ کر آیا تھا۔ بہرحال چوتھے دن دفتر پہنچا۔ میری دوسری ساس وعدے کے مطابق آدھمکی۔ آتے ہی کہا۔ ”وہ نکاح نامہ مجھے چاہیے۔“

میں نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ بیٹھیے تو سہی۔“

”نہیں بیٹے! مجھے فیروزہ پہلے ہی دن بتا چکی ہے کہ تمھیں ساس کے رشتے سے سخت نفرت ہے۔ کبھی ثابت کردوں گی کہ ساس بھی قابلِ محبت ہوتی ہے‘ لیکن وہ اپنے حالات سے مجبور ہوتی ہے۔ اپنی بیٹی کا مستقبل بنانے کے لیے ہر جائز اور ناجائز راستے پر چل پڑتی ہے۔ کسی کے نقصان کی پروا نہیں کرتی‘ اُسے صرف اپنی بیٹی یا بیٹے کے مستقبل کی پروا ہوتی ہے۔“

میں نے نکاح نامے کی ایک کاپی اُن کے حوالے کردی۔ وہ اسے لے کر بولیں۔

”میں جا رہی ہوں۔ میری دوسری شرائط یاد رکھنا اور جلد ہی پوری کر دینا۔ میں بعد میں فون کے ذریعے رابطہ قائم کروں گی۔“

میں نے انھیں روکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اپنی بیٹی سے ملاقات کریں؟ ذرا دیکھیں تو سہی‘ وہ سہاگن بن کر کتنی خوش ہے لیکن یہ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہے کہ پتا نہیں آپ اس کیسٹ کا کیا کریں گی؟“

”اُسے سوچنے دو‘ پریشان ہونے دو۔ میں اس کی پریشانی دور کردوں گی لیکن یاد رکھو‘ کبھی بھولے سے بھی یہ نہ کہنا کہ میرے تمھارے درمیان کیا معاملات چل رہے ہیں۔“



وہ چلی گئیں۔ تین دن تک میں بہت خوش تھا‘ بہت کچھ بھولا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ مجھے غصہ کرنا آتا ہے۔ اس بڑھیا کو دیکھ کر مجھے بہت غصہ آرہا تھا اور پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ کیا مجھے ڈیفنس والی کوٹھی فیروزہ کے نام کرنی ہوگی۔ دس لاکھ کی بیمہ پالیسی لینا ہوگی۔ پانچ لاکھ روپے فیروزہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرنے ہوں گے۔ یہ تو بڑے مشکل مراحل تھے۔

بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ میں اپنی ذہنی پریشانی اپنی شریکِ حیات پر ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ پھر بھلا شریکِ حیات ہوتی کس لیے ہے۔ مجھے یقین تھا کہ فیروزہ کو معلوم ہوتا تو وہ مجھے محبت سے چھپالیتی تسلیاں دیتی اور مجھے ہر طرح کی پریشانیوں سے نجات دلاتی لیکن میں اس سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن اُس نے خود ہی پوچھا۔ ”کیا بات ہے‘ آپ میرے سامنے خوش رہتے ہیں۔ جب میں دوسرے کمرے میں یا کچن میں چلی جاتی ہوں اور وہاں سے آکر دیکھتی ہوں تو آپ گہری سوچ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔“

”کچھ نہیں‘ بس کاروباری معاملات ہیں۔“

”ایسے بھی کیا کاروباری معاملات ہیں۔ میں زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوں مگر اس حد تک لکھنا پڑھنا جانتی ہوں کہ آپ کے معاملات کو سمجھ سکوں۔“

”یہ نہ تو پڑھنے لکھنے کی بات ہے نہ کاروبار کی۔ دراصل میں تمھارے مستقبل کے لیے سوچتا ہوں‘ کیا کروں؟“

”آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”پہلے ڈیفنس والی کوٹھی تمھارے نام کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ محبت سے نہال ہوگئی۔ میرے پاس آکر بولی۔ ”آپ میرے لیے محبت سے اتنا سوچتے ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں ڈیفنس والی کوٹھی نہیں لوں گی۔ اس پر واجدہ کا حق ہے۔“

میں نے بڑی محبت اور عقیدت سے اُسے دیکھا۔ واقعی وہ دل میں گھس کر جگہ بنانے والی عورت تھی۔ میں نے کہا۔ ”فیروزہ! تم جانتی ہو‘ انسان کی زندگی اور موت کا

کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں' جلد سے جلد تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ نہیں تو پانچ لاکھ روپے ہی جمع کرادوں۔"

"یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ میں نے کب آپ سے کسی رقم کا تقاضا کیا ہے یا بہت زیادہ فرمائش کی ہے۔ ایک بیوی کے جو حقوق ہیں' وہی مانگتی ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔"

"چلو ایسا کرتے ہیں کہ دس لاکھ کی ایک بیمہ پالیسی لے لیتا ہوں۔ اس رقم کی حقدار تم رہوگی۔"

"آپ ایسی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال اپنے کاروبار کی طرف توجہ دیں اور مجھے بتائیں کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ کس طرح خوش رکھ سکتی ہوں اور کس طرح ذہنی سکون پہنچاسکتی ہوں؟"

میں نے متاثر ہوکر کہا۔ "اوہ گاڈ' میں تمہیں کلوٹی کہا کرتا تھا' چھوٹی ذات اور نچلے طبقے کی ایک معمولی نوکرانی سمجھتا تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تو کیا ہوا' آپ میرے ہیں۔ مجھے کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن ایک بات کہتی ہوں۔ اگر غریب لڑکی سے شادی کی جائے تو وہ دوسری عورتوں کی طرح لالچی تو ہوسکتی ہے مگر اتنی نہیں کہ اپنے لالچ میں شوہر کو نقصان پہنچادے۔ میں نے ہر غریب لڑکی کی طرح ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب بڑی حد تک پورے ہو رہے ہیں۔ میں اس حد سے آگے جانا نہیں چاہتی۔ جو عورت اعتدال پسند نہیں ہوتی وہ اپنے شوہر کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور اپنی ذات کو بھی۔"

آدمی کو زہر دو تو حفاظتی تدابیر سے بچ سکتا ہے لیکن پیار سے مارو تو فوراً مرجاتا ہے۔ میں اُسی لمحے فیروزہ کے ہاتھوں مرگیا۔ میں نے دوسرے ہی دن ایک بیمہ ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا اور دو دن کے اندر ہی دس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی لے لی۔ کاغذات میں فیروزہ کا نام دس لاکھ روپے کی حقدار کی حیثیت سے درج کرا دیا۔ اگرچہ میرا لاکھوں روپے کا ٹھیکہ چل رہا تھا' بنک میں تقریباً تین لاکھ روپے تھے لیکن ابھی میں فیروزہ کے بنک بیلنس میں پانچ لاکھ کی رقم جمع نہیں کرسکتا تھا' جو کچھ بھی میرے پاس تھا' وہ کاروبار کو



جاری رکھنے کے لیے تھا۔

دوسری ساس کی شرط کے مطابق ڈیفنس والی کوٹھی فیروزہ کے نام کرنا بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ادھر میں کوٹھی فیرزوہ کے نام منتقل کرنے کے لیے کاغذات تیار کروں گا اور اُدھر پہلی ساس کو خبر ہوجائے۔ میں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ایک دن میں سائیٹ پر سے واپس آرہا تھا' اچانک ہی میری کار ایک سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکراگئی تھی بڑا زبردست حادثہ ہوا تھا۔ مجھے تو ہوش نہیں رہا۔ لوگوں نے اسپتال تک پہنچایا۔ جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ ایک رات بے ہوشی کی حالت میں گزر چکی ہے۔ میں خطرے سے باہر تھا مگر بُری طرح زخمی تھا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے فیروزہ کو دیکھا۔ وہ پریشان تھی۔ میرے بستر کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر فوراً ہی میرے پاس آئی' میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرے ہاتھ کو تھام کر کچھ کہنا چاہتی تھی مگر فرطِ جذبات سے کچھ کہہ نہیں پارہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

شام تک میری طبیعت سنبھل گئی۔ چونکہ زخموں سے چُور تھا اس لیے اسپتال میں پڑا رہا۔ جب غلمی صاحب اور دوسرے ملنے والے آتے تو فیروزہ میرے پاس سے چلی جاتی تھی تاکہ کسی کو ہمارے میاں بیوی ہونے کا شبہ نہ ہو۔ وہ خود اس بات کو چھپا رہی تھی۔ مجھے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

دوسرے دن غلمی صاحب ایک اخبار لے کر آئے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُنھوں نے آہستگی سے کہا۔ "تم بہت حوصلہ رکھتے ہو۔ میں ایک بُری خبر سُنانے آیا ہوں۔ اگر نہیں سناؤں گا تو کسی اور کے ذریعے سُن لوگے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کسی نے تمہاری بیوی واجدہ کو قتل کردیا ہے؟"

یہ سُنتے ہی میں خلا میں تکتا رہ گیا۔ مجھے واجدہ نظر آرہی تھی۔ اب اُس کی آنکھیں بھیگی نہیں تھیں۔ وہ پاؤں سے اپاہج نہیں تھی۔ میرے سامنے چل رہی تھی۔ سُنا ہے

مرنے کے بعد حشر کے میدان میں تمام جسمانی عیب دور ہو جائیں گے۔

اسی وقت مجھے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر گھما کر پلنگ کے دوسری طرف دیکھا۔ میری پہلی ساس منہ پر آنچل رکھے رو رہی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ چہرہ بھی بھیگ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

"میں لٹ گئی۔ برباد ہوگئی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بے چاری سچ مچ لٹ گئی۔ میری ڈیفنس والی کوٹھی اب اس کے اختیار میں نہیں رہی۔ میری کمائی میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں رہا۔ اب وہ مجھ پر کسی رشتے سے رعب نہیں جماسکتی۔ اس کے کتنے حقوق چھن گئے تھے۔ بے چاری سچ مچ لٹ گئی تھی۔ برباد ہوگئی تھی۔"

میں نے آنکھیں کھول کر نقاہت سے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا' اسے کس نے قتل کیا؟ کیوں کیا؟ اس بے چاری اپاہج عورت سے کسے دُشمنی ہوسکتی تھی؟"

خلجی صاحب نے کہا۔ "پولیس والے تفتیش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ میں پرسوں شام کو بُری طرح زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ اب تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ورنہ یہ میری خوشدامن صاحبہ تو پہلی فرصت میں مجھے ہی واجدہ کا دُشمن اور قاتل قرار دیتیں۔"

"ہائے بیٹا! مجھے اور صدمہ نہ پہنچاؤ۔ میں نے پہلے بھی تمہارا بُرا نہیں چاہا' اب بھی نہیں چاہوں گی۔ جو کچھ تمہارے خلاف کہتی رہی یا کرتی رہی' وہ محض اپنی بیٹی کے حقوق کے لیے۔ اگر میں تمہاری مخالفت کرتی تھی تو بیٹی کی حمایت کرنے کے لیے۔ اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی اور تمہاری ماں اُس کی حمایت میں اپنے داماد کی مخالفت کرتی تو تم اپنی ماں کو کبھی ظالم ساس نہ کہتے۔"

میں نے ناگواری سے اس عورت کو دیکھا۔ جس سے اب نجات مل چکی تھی۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر نے مجھے زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔"

اُس کے بعد میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ دوسری بار آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ جاچکی تھیں۔ خلجی صاحب نے کہا۔ "تمھیں اپنی سابقہ ساس کے ساتھ اس طرح گفتگو



نہیں کرنا چاہیے۔"

"جناب' آپ نہیں جانتے' اس نے مجھے کتنے رُعب میں رکھا تھا۔ ہمیشہ دھونس جماتی تھی کہ اس کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ اب یہ تمام وسیع ذرائع لے کر میرا کیا بگاڑ لے گی۔ کس کے لیے مجھ سے حقوق طلب کرے گی؟"

"جو ہوگیا' اُس پر مٹی ڈالو اور اس خاتون کو معاف کردو۔"

"میں نے معاف کردیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آخری وقت اپنی شریکِ حیات کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ میں اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' تم آرام کرو۔"

وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد میری پہلی ساس مجھے تنہا دیکھ کر پھر کمرے میں آئیں۔ میں نے کہا۔ "شاید آپ یہ دیکھنے آئی ہیں کہ میں یہاں سے اُٹھ کر آپ کی صاحبزادی کی آخری رسومات میں شریک ہوسکتا ہوں یا نہیں؟"

"بیٹے! سچ پوچھو تو میں یہی دیکھنے آئی تھی۔ کسی طرح تم وہاں چل سکتے تو آخری دیدار ہوجاتا۔ بہرحال میں تمہاری مجبوریاں سمجھ رہی ہوں۔"

"آپ نے میری مجبوریاں نہ کبھی سمجھی تھیں نہ کبھی سمجھیں گی۔ آپ نے ڈاکٹر سے تصدیق کی ہے' تب یقین کیا ہے کہ میں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"اب تو طعنے نہ دو۔"

"آپ واجدہ کا سوئم کریں گی؟"

"وہ تو ضروری ہے۔"

"میں اس کے چالیسویں تک صحت یاب ہوجاؤں گا۔ چالیس دن کے بعد آپ میری کوٹھی چھوڑ دیجیے گا۔"

انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر کہا۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ابھی میری بیٹی کی میت گھر میں پڑی ہے اور تم مجھے بے گھر کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ کوئی لاوارث' غریب اور محتاج نہیں ہیں۔ آپ کی ایک کوٹھی ڈیفنس میں

موجود ہے۔"

"وہ میں نے کرائے پر اٹھا رکھی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو چالیس دن تک اپنی کوٹھی میں رہنے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اپنا ٹھکانہ کرلیں۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ انھوں نے مجھے مخاطب کیا میں نے پھر کہا۔ "ڈاکٹر نے مجھے زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔"

خاموشی چھاگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا' کمرہ خالی تھا۔ وہ جاچکی تھیں۔ اگرچہ میں نے ان کے ساتھ بہت ہی غیراخلاقی رویہ اختیار کیا تھا لیکن میں نے پچھلے کئی سال اُن کے سائے میں رہ کر جیسی ذہنی اذیتیں برداشت کی تھیں' وہ میں جانتا ہوں' میرا اللہ جانتا ہے۔ میں پہلی فرصت میں ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا' اس لیے اُنھیں چالیس دن کی مہلت دے دی تھی تاکہ یہ شکایت نہ رہے کہ میں نے اچانک ہی گھر سے نکال دیا ہے۔ اگرچہ خوش اخلاقی اچھی چیز ہے لیکن میں اس قدر خوشِ اخلاق نہیں بن سکتا کہ بیک وقت دو ساسوں کو برداشت کرسکوں۔

کہتے ہیں شیطان کو یاد کرو تو وہ فوراً پہنچ جاتا ہے۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میری دوسری ساس پہنچ گئی تھی۔ میں تکلیف سے کراہنے لگا۔ اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ زخموں کی تکلیف سے کراہا تھا یا ساس کی۔

وہ کمرے کے اندر آتے ہوئے بولیں۔ "مجھے تمھارے حادثے کی اطلاع مل گئی تھی لیکن مجبور تھی۔ کچھ تو مصروفیات کا تقاضا تھا اور کچھ اپنی بیٹی کی نفرت کا۔ وہ مجھے یہاں برداشت نہیں کرے گی۔"

اسی وقت دروازے سے فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ "ہاں' میں آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ کس نے کہا تھا آپ کو یہاں آنے کے لیے۔ ابھی یہاں سے چلی جائیں۔"

میں نے پہلی بار دوسری ساس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور دُکھ کی پرچھائیاں دیکھیں۔ وہ بڑی ممتا سے بولیں۔ "بیٹی! اپنا چاہے جتنا بھی بُرا ہو' اتنی بری طرح نہیں



دھتکارنا چاہیے۔ ابھی تو وہ کیسٹ میرے پاس ہے۔ تقدیر نے خود ہی فیصلہ کردیا ہے۔ کسی نے واجدہ کو قتل کردیا۔ ایسے میں وہ کیسٹ پولیس کے ہاتھ لگے گا تو سمجھ لو' تمھارے سہاگ پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹ پڑیں گی۔"

فیروزہ کو چپ لگ گئی۔ وہ فوراً ہی ماں کے پاس آکر بولی۔

"امی' پلیز وہ کیسٹ مجھے دے دیجیے۔"

"میں تمھاری دشمن نہیں ہوں۔"

"میں دوست اور دُشمن کچھ نہیں جانتی' وہ مجھے دے دیجیے۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولیں۔ "ضرور دے دوں گی۔ میں جانتی ہوں' اُسے حاصل کرنے کے بعد بھی تم مجھ سے محبت نہیں کروگی۔ تم مجھے ظالم سمجھتی ہو اور ظالم سمجھتی رہوگی۔ بچپن سے جو نفرت تمھارے دل اور دماغ میں جڑیں پکڑ چکی ہے' میں ان جڑوں کو اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں وہ کیسٹ تمھیں دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں؟"

اس نے ماں کو دیکھا۔ پھر نظریں چُراتے ہوئے کہا۔ "امی! آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی موجودگی سے میری ازدواجی زندگی میں کیسی کیسی مصیبتیں آسکتی ہیں۔ آپ نے زندگی گزارنے کے لیے ہمیشہ غلط راستوں کا انتخاب کیا ہے۔ میرا راستہ آپ سے بالکل الگ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس راستے میں آپ کی طرف سے کانٹے بچھائے جائیں۔"

"تم دُرست کہتی ہو' میں تمھارے راستے میں نہیں آؤں گی۔"

اُنھوں نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک کیسٹ نکالا۔ اُسے دیکھتے ہی فیروزہ نے لپک کر لے لیا۔ اس کی امی نے کہا۔

"یہ وہی کیسٹ ہے جو میں چُرا کر لے گئی تھی لیکن اب اس میں تمھاری اور تمھارے دولہا کی آواز نہیں ہے۔ میں نے کچھ باتیں تم سے اور اپنے داماد سے کی ہیں۔ خدا کے لیے اُنھیں ایک بار سُن لینا پھر چاہو تو اسے ضائع کردینا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر فیروزہ کے پاس گئیں۔ آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھا کر اُس کے سر پر رکھا۔ اُسے

دعائیں دیں۔ اس کے بعد دروازے کے پاس جاکر کہا۔ ”میں ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے دور جارہی ہوں۔ میری آخری خواہش ہے کہ اس کیسٹ کو تنہائی میں ضرور سننا اور سننے سے پہلے دروازے کو اندر سے بند کرلینا۔“

وہ مشورہ دے کر چلی گئیں۔ فیروزہ اس کیسٹ کو ہاتھ میں رکھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اُنھوں نے ضرور کوئی خاص بات ریکارڈ کی ہوگی۔ کیا تم نے کبھی اپنی امی کو اس قدر سنجیدہ دیکھا ہے؟“

اس نے انکار میں سرہلا کر کہا۔ ”کبھی نہیں‘ میں خود سوچ رہی ہوں‘ آخر بات کیا ہے؟“

”کہیں سے کیسٹ ریکارڈر لے آؤ۔“

وہ میرے پاس کیسٹ رکھ کر باہر چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا کیسٹ ریکارڈر تھا۔

وہ دروازے کو بند کر کے میرے پاس آگئی۔ ہم نے کیسٹ کو ریکارڈر میں لگایا۔ پھر اُسے آن کردیا۔ چپ چاپ اس ریکارڈر کو دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد ہی فیروزہ کی امی کی آواز سنائی دی۔

”بیٹی فری! شاید تمھیں یاد نہ رہا ہو‘ جب میں تمھارے ساتھ رہی‘ تمھیں پیار سے فری کہہ کر مخاطب کرتی رہی۔ مانا کہ تمھیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔ تمھارا باپ بہت اچھا‘ بہت ہی نیک آدمی تھا لیکن میں اُن عورتوں میں سے ہوں جو بہت زیادہ نرم اور سیدھے مردوں کو پسند نہیں کرتیں۔ میں بھی ایک بدمعاش کے پیچھے چلی گئی لیکن اللہ بہتر جانتا ہے‘ تم مجھے اُس لمحے یاد آتی رہیں جس لمحے انسان کا ضمیر اُسے جھنجوڑتا ہے‘ میری ممتا جب بھی جوش میں آتی تھی‘ میں تڑپ جاتی تھی۔ سوچتی تھی تم ایک اچھے باپ کے سائے میں ہو۔ اچھی طرح پرورش پاؤگی‘ مجھے تمھاری فکر نہیں کرنا چاہیے۔ میں تمھاری طرف سے سنگدل بننے کی کوشش کرتی رہی اور آج تک ناکام رہی۔ بہرحال میں اپنی روداد سنا کر اپنے لیے کوئی ہمدردی حاصل نہیں کرنا چاہتی۔ سب سے پہلے تم یہ اطمینان کرلو یہ وہی کیسٹ ہے جسے میں تمھارے ہاں سے چُرا



کر لے گئی تھی۔ اب اس میں میری آواز سنائی دے رہی ہے۔ جس آواز کو کہیں سے کہیں پہنچنا چاہیے تھا‘ اُسے میں نے ہمیشہ کے لیے مٹادیا ہے۔

بیٹی! میں نے تمھیں لاکھ سمجھایا کہ ایک ہنستی بستی خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے زیادہ نہیں تو تھوڑی سی بے ایمانی کرو‘ لیکن تم ہمیشہ میرے مزاج کے برعکس ثابت ہوتی رہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تم اپنی سوکن کی حفاظت کر رہی تھیں۔ اس کیسٹ کو صرف اپنے لیے نہیں‘ اپنی سوکن کے تحفظ کے لیے بھی چھپا رکھا تھا۔ میں نے تمھارے جیسی نادان لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔

آخر مجھے اپنے طور پر فیصلہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے وہ کیسٹ تمھارے ہاں سے چُرا لیا۔ تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ میں فائدہ اٹھانا چاہتی تھی لیکن ان ہی دنوں پتہ چلا کہ تم دونوں نے شادی کرلی ہے۔ میرے دل کا غبار کچھ کم ہوا میں نے سوچا‘ آج تم نے اپنے میاں کو جیت لیا ہے‘ کل اس سے اپنے دوسرے حقوق بھی حاصل کرلوگی۔“

میں کیسٹ سُن رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ کیسٹ کے اس حصے میں میری دوسری ساس نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حقیقتاً اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔ فیروزہ سے شادی کرنے پر مجبور کیا تھا اور بہت سی شرائط پیش کی تھیں لیکن اس کیسٹ میں فیروزہ کے سامنے اس کا اقرار نہیں کر رہی تھی۔

بہرحال اس کیسٹ سے آواز آرہی تھی۔ ”میری بیٹی فری! ہم سب کل کی آس میں جیتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت سے لوگوں کو ”کل“ کچھ نہیں دیتا۔ میں آنے والے اچھے دنوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والی عورت نہیں ہوں۔ اکثر سوچتی تھی اگر تمھارے میاں نے تمھیں وہ تمام حقوق نہ دیئے جو واجدہ کو مل رہے ہیں تو میری بیٹی کا کیا بنے گا۔ کیا اسے ایک غریب اور نچلے طبقے کی لڑکی سمجھ کر نظرانداز کیا جائے گا۔ اُسے سوسائٹی میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ ایسے ہی بہت سے خیالات میرے دماغ میں گردش کرتے رہتے تھے۔ پھر پرسوں مجھے اطلاع ملی کہ میرے داماد حادثے میں بُری طرح زخمی ہوگئے ہیں اور اسپتال پہنچائے گئے ہیں۔ میں چپ چاپ اسپتال پہنچی۔ وہاں اس کی تصدیق

کی۔ تب میرے دماغ نے کہا' یہ اچھا موقع ہے' اگر میں واجدہ کو قتل کردوں تو میرے داماد پر نہ کوئی شبہ کرسکے گا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرسکے گا۔

بیٹی' یہ نہ سمجھنا کہ واجدہ کو میں نے قتل کیا ہے۔ یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں ارادہ کررہی تھی کہ اخبارات میں واجدہ کے قتل کی خبر شائع ہوگئی۔ جو کام میں کرنا چاہتی تھی' وہ کسی اور نے کردیا۔ اخباری خبر کے مطابق کوئی چور وہاں گھس آیا تھا۔ واجدہ کے کچھ زیورات فرش پر بکھرے ہوئے پائے گئے تھے۔ یہ خیال قائم کیا گیا ہے کہ چور چوری کررہا تھا' اسی وقت واجدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کی خاطر چور نے اُسے قتل کردیا۔ بہرحال مجھے افسوس تو ہوا لیکن اطمینان بھی ہوا۔ اب تمہاری سوکن نہیں رہی۔ اسے میری سنگدلی نہ کہو۔ ایک ماں اپنی بیٹی کے لیے یہی سوچتی ہے کہ اُس کی زندگی میں اس کی کوئی سوکن نہ آئے۔"

میں اپنی ساس کی آواز سُن رہا تھا مگر یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ واجدہ کو کسی اور نے قتل کیا ہے۔ جس طرح میری ساس اپنی بیٹی سے اور بہتؔ سی باتیں چھپا رہی تھی' اسی طرح قتل کی واردات کو بھی چھپا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی کے ضمیر پر کوئی بوجھ پڑے اور وہ ہمیشہ یہ سوچتی رہے کہ اس کی ماں نے سوکن کا کانٹا صاف کیا اور وہ اُس کی جگہ زندگی گزار رہی ہے۔ فیروزہ ایسے ہی دل و دماغ کی لڑکی تھی۔ اگر اُسے پتا چل جاتا کہ ماں نے ایسی حرکت کی ہے تو وہ میری اس کوٹھی میں جاکر رہنے کے لیے تیار نہ ہوتی۔ ہم دونوں کی ازدواجی زندگی میں ضمیر کی ایسی آندھی چلتی کہ ہزار دولت کمانے کے باوجود ہمیں مسرّتیں حاصل نہ ہوتیں۔

کیسٹ ریکارڈر سے وہ آوز اُبھر رہی تھی۔ اس بار انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بیٹے! تم داماد ہو مگر بیٹوں سے زیادہ عزیز ہو۔ تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک بیٹی کی ماں اپنے داماد کو کتنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں جو بھی کیا اور میری ذات سے تمھیں جو بھی تکلیف پہنچی' اس کے لیے معاف کردو۔ میں اس دنیا سے جارہی ہوں۔ میرا اب کوئی نہیں ہے ایک آخری خواہش تھی کہ بارہ برس کی عمر میں بیٹی کو چھوڑ کر جو بہت بڑی غلطی کی' اس کی بھرپور تلافی کردوں۔ آج مطمئن ہوں میں نے تلافی



کرلی ہے لیکن دوسری طرف میرا ضمیر مجھے مار رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں' یہ دُنیا والے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قانون کبھی مجھے اپنی گرفت میں نہیں لے سکے گا لیکن میں زندہ رہ کر کیا کروں؟ جب تک میرے یہ آخری الفاظ تم دونوں تک پہنچیں گے' اس وقت تک میں موت کی آغوش میں پہنچ چکی ہوں گی۔"

میں نے اور فیروزہ نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔ "دیر کیوں کررہی ہو۔ دیکھو امی زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔ اُنھیں بلا کر لے آؤ۔ انھیں معاف کردو۔"

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک اپنی دوسری ساس کے متعلق سوچتا رہا۔ ساری باتیں واضح ہوگئی تھیں۔ انھوں نے جس بیٹی کو چھوڑنے کی غلطی کی تھی' اس کے لیے دُنیا کی بہت سی خوشیاں جیت کر دُنیا سے جارہی تھیں۔ میں نے اس کیسٹ ریکارڈر کو دیکھا پھر اسے آن کیا۔ "میرے بچو! میری آخری خواہش ہے' اس آواز کو سننے کے بعد ریوائنڈ کرنا اور اسے ہمیشہ کے لیے مٹا دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ دنیا والے کسی بھی طرح مجھ سے تم دونوں کا ناتا جوڑلیں۔ پہلے بھی کوئی مجھے فیروزہ کی ماں نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی جانتا تھا' آج کے بعد بھی دنیا نہیں جان سکے گی۔

اللہ حافظ' میری جان فری! اللہ حافظ میرے بچے! میرے بیٹے' میرے داماد!"

اس کے ساتھ ہی آواز گم ہوگئی۔ کیسٹ چلتا رہا مگر خاموش رہا۔ میں نے اُسے آف کیا پھر ریوائنڈ کیا۔ اس کے بعد پلے اور ریکارڈنگ کے بٹن ایک ساتھ دبا دیے۔ کیسٹ چلنے لگا۔ میں خاموش تھا۔ کسی کی آواز ریکارڈ نہیں ہورہی تھی۔ چھت پر پنکھا گردش کر رہا تھا صرف اسی کی آواز ریکارڈ ہوسکتی تھی۔ کافی دیر کے بعد فیروزہ واپس آئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑگیا تھا۔ زلفیں بکھر گئی تھیں۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے بستر کے پاس آئی۔ اس کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے پھر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"امی۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "امی ایک حادثے کا شکار ہوگئی ہیں۔ کسی بڑے ٹرک کے نیچے آگئیں۔ لوگ یہی کہتے ہیں' جان بُوجھ کر ٹرک کے سامنے آگئی تھیں۔ اُنھیں اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا تھا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ چکی تھیں۔"

وہ پھر سسک کر رونے لگی۔ پھر اُس نے دونوں گھٹنے فرش پر ٹیک دیے۔ اپنا سر میرے پلنگ کی پٹی پر رکھ دیا۔ وہ رو رہی تھی' کیسٹ چل رہا تھا۔ میں نے سوچا' خوشدامن تو خوشی سے دامن بھرنے والی کو کہتے ہیں۔ کوئی عورت ساس نہیں ہوتی۔ سب مائیں ہوتی ہیں۔ البتہ جن ماؤں کی بیٹیوں کو ان کے حقوق نہیں ملتے' وہ روایتی ساس بن جاتی ہیں۔

کیسٹ ابھی تک چل رہا تھا۔ فیروزہ ابھی تک رو رہی تھی۔ میری ساس نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کو مٹایا تھا' میں اُس کی آواز مٹا رہا تھا۔

==============================

# رشتہ

تصویروں کی نمائش میں مردوں اور عورتوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ آرٹسٹ انور علی نے تصویروں کے ذریعے ننگے بھوکے بنگال کو پیش کیا تھا۔ ویسے جو لوگ تصویروں کو دیکھنے آئے تھے وہ بھوکے نہیں لگتے تھے۔ عمدہ لباس بھی پہنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک حسینہ سب سے قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بدن پر سونے کے زیورات بھی تھے۔ اس بھیڑ میں وہ سب سے منفرد' سب سے امیر عورت لگ رہی تھی۔ بھوکوں اور ننگوں کی تصویریں کون دیکھتا ہے۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔

انور علی ایک منجھا ہوا معروف مصور تھا۔ خاکوں اور رنگوں کے ذریعے انسانوں کی بدحالی کو بڑی چابکدستی سے پیش کرتا تھا۔ آرٹ گیلری کی دیواروں پر یہاں سے وہاں تک ننگے اور بھوکے عوام کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔ بدصورتی سے منہ پھیر کر خوبصورتی کو جی بھر کے دیکھتا ہے۔ انور علی بھی اپنی تصویروں کو بھول کر اس منفرد اور امیر عورت کے حسن کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

وہ اتنی بڑی دنیا میں صرف اپنے فن کو چاہتا تھا۔ اس روز اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اس حسینہ کی چاہت کرنے لگا ہے۔ اس کا مغرور انداز اور حسن کا رعب اور دبدبہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نہ تو دولت سے' نہ محبت سے اور نہ ہی بازو کی قوت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کوئی خوش نصیب اسے حاصل کر چکا ہو گا۔ یا حاصل کرنے والا ہو گا۔ اس کے باوجود انور چاہت کے لطیف جذبوں میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔

پہلے تو اس سے شناسائی پیدا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے سوچتا رہا کہ کسی طرح اس سے دو باتیں ہی کر لے۔ آخر اس نے آرٹ گیلری کے مہتمم کے پاس آ کر پوچھا۔ "کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟"



"کون سی عورت؟" مہتمم نے پوچھا۔

"وہ جس نے ساڑھی پہنی ہوئی ہے۔"

"یہاں تو سبھی بنگالی عورتیں ساڑھی پہنتی ہیں۔"

انور کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے وضاحت کی۔ "میرا مطلب ہے' وہ جس نے قیمتی زیورات بھی پہنے ہیں۔"

"اچھا وہ۔" مہتمم نے سر ہلا کر کہا۔ "اس کا نام مومی ہے۔ پورا نام مومنہ بیگم ہے۔ شاعرہ ہے۔ مومی جیسا مختصر سا خوبصورت نام اس پر جچتا ہے۔"

واقعی وہ موم کا حسین مجسمہ لگ رہی تھی۔ ایسی گوری اجلی چکنی نار تھی کہ نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ کیا آپ میرا تعارف کرانا پسند کریں گے؟"

"ضرور۔" مہتمم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ آیئے۔"

وہ آگے بڑھا تو دل بے اختیار سینے میں اچھلنے لگا۔ مہتمم نے حسینہ کے قریب پہنچ کر بنگالی زبان میں کہا۔ "مومی ان سے ملو۔"

وہ سر اٹھائے ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ مہتمم کی آواز پر اس نے ایک ادائے ناز سے گھوم کر انور کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دل کے ورق پر نقش ہو رہی تھیں۔

مہتمم نے کہا۔ "یہ انور آرٹسٹ ہیں جن کی تصویریں تم یہاں دیکھ رہی ہو۔"

مومی نے انور کو گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر شاید اسے خیال آگیا کہ ایک عورت کی حیثیت سے نظروں کے مفہوم میں گہرائی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جلدی سے مہتمم کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اچھا۔ تو آپ ہی انور صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ کے یہاں آنے سے میری حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔"

"اور میں یہاں آ کر ایک بہت بڑے فنکار سے ملنے کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔"

وہ جانے کیوں پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی اپنی نظریں اس کے قابو میں نہیں رہی ہیں۔ دوسرے لمحے وہ پھر سنبھل کر نظریں نیچی کرتے

ہوئے ساڑھی کے آنچل سے کھیلنے لگی۔ اسی وقت مہتمم کو کسی نے آواز دی تو وہ ادھر چلا گیا۔

انور نے کہا۔ "میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ کس طرح آپ سے مل بیٹھوں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ میرے اور آپ کے درمیان بہت پرانا رشتہ ہے۔"

اس نے حیرانی سے دیکھا تو اس کی آنکھیں اور خوبصورت لگیں۔ وہ بولی "کیا ہم آپس میں رشتے دار ہیں؟ مگر نہیں۔ آپ بنگالی بول رہے ہیں لیکن لہجے سے بہاری معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بنگالی اور بہاری آپس میں رشتے دار کیسے ہو سکتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میری مادری زبان اردو ہے لیکن میں بچپن سے مشرقی پاکستان میں ہوں۔ جوانی بھی یہاں گزر رہی ہے۔ اس لحاظ سے میں صرف بہاری نہیں، بنگالی بھی ہوں۔"

"مگر ہم رشتے دار کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"ہمارے درمیان فن کا بہت پرانا رشتہ ہے۔ آپ شاعرہ ہیں، میں مصور ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اوہ، اب سمجھی۔ مگر میں کوئی نامور شاعرہ نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھی دل کی بات لفظوں میں ادا کر دیتی ہوں۔"

"دل کی بات ہر کوئی لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔ اگر بنگالیوں اور بہاریوں کو دل کی بات کہنے اور سمجھانے کا سلیقہ آتا تو آج اتنے برس تک ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے نظر نہیں آتے۔"

مومی نے کہا۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ دل کے اندر کی بات ایک فنکار ہی کر سکتا ہے۔ آپ نے بہاری ہو کر بھوکے بنگال کی صحیح عکاسی کی ہے۔ آج سے میں آپ کو بنگالی ہی سمجھوں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں آپ کے دل کی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "مم......... میرے دل کی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے؟ آ......... آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ بطور فنکارہ ایک فنکار کو بنگالی اور بہاری کی طرح الگ سمجھتی ہیں یا



دل کے قریب؟"

اچانک مومی کا حسین چہرہ کسی چور جذبے سے تمتمانے لگا۔ انورؔ کے سوال کا جواب آسان نہیں تھا۔ وہ گڑبڑا گئی کہ کیا بولے اور کیا چھپائے وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

"ایک فنکار دوسرے فنکار کے اور اس کی سوچ کے قریب ہوتا ہے۔"

"میں آپ کے اشعار کو آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"کسی ادبی انجمن میں ملاقات ہو گی تو سنا دوں گی۔"

"انجمن تو کہیں بھی کسی وقت بھی سجائی جا سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم کل بھی مل سکتے ہیں۔"

"کل؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ......... یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ابتدا میں جھجک ہوتی ہے ملتی رہیں گی تو اچھا لگے گا۔ میں کل شام کو رمنا پارک کی جھیل کے کنارے آپ کا انتظار کروں گا۔"

وہ جلدی سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔ وہ بولا۔ "جواب دے کر جائیے۔"

"سوچوں گی۔" وہ ساڑھی کا آنچل سنبھالتے ہوئے وہاں سے دور چلی گئی۔ دور ہونے کے بعد اس نے ایک ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر جلدی جلدی قدم بڑھاتی اس ہال سے باہر چلی گئی۔ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

انور نے ایک گہری سانس لی۔ مومی کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ باتوں کے دوران رہ رہ کر اسے دیکھ رہی تھی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ یا جیسے انور کی ذات میں وہ اپنی کوئی گمشدہ چیز پانے والی ہو۔ وہ تمنا کرنے لگا کہ وہ مومی کی ضرورت بن جائے۔ کسی کو کسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب ہی محبت ہوتی ہے اور جب محبت ہوتی ہے تو بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ انور کی بے چینی یہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر مومی کے لیے ایک ضدی بچے کی طرح مچلنے لگا تھا۔

بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگ بھی زندگی کے کتنے ہی موڑ پر ناسمجھ بچے کی طرح پرائے مال کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ مومی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس پر کس خوش نصیب کا حق ہے؟ وہ جیسی بھی ہے، جس کی بھی ملکیت ہے، انور

اسے اپنانا چاہتا تھا۔ زندگی کے ایسے ہی موڑ پر آدمی کو بچہ کہنا چاہیئے یا دیوانہ۔

اس رات وہ بستر پر لیٹا' جاگتی آنکھوں سے اس کے خواب دیکھتا رہا اور اس چھوٹی سی ملاقات کا تجزیہ کرتا رہا کہ مومی بھی اس کی طرف مائل ہے یا نہیں؟ وہ کل شام کو ملنے آئے گی یا نہیں؟ دل کہتا تھا' آئے گی۔ دماغ کہتا تھا کہ ایک ایسے شخص سے ملنے کیوں آئے گی جس سے دور کا بھی رشتہ نہ ہو۔ فنکار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جھیل کنارے ملاقات شروع ہو جائے۔

مومی ویسے تو بڑی مغرور اور بڑی رکھ رکھاؤ والی لگتی تھی۔ اس کے باوجود عورت کو سمجھنا مشکل ہے کہ وہ کب' کس پر مہربان ہو جائے۔ دوسرے دن شام کو وہ تقدیر کی طرح مہربان ہو کر اور دعا کی طرح قبول ہو کر جھیل کنارے آ گئی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ لانبے سیاہ بالوں کا خوبصورت جوڑا بنایا ہوا تھا۔ اس جوڑے پر پھولوں کی وینی سجی ہوئی تھی۔ گورے مکھڑے پر میک اپ نہیں تھا۔ سحر زدہ کرنے کے لیے قدرتی حسن کافی تھا۔ انور گھاس پر سے اُٹھ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ کئی لمحات تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بولے۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک امیر کبیر اور مغرور حسن کی مالکہ نے آنے کا وعدہ پورا کیا تھا۔

مومی نے کچھ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر گزرنے والوں کو دیکھا پھر جلدی سے قریب آ کر آہستہ سے بولی۔ "آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا دوسروں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اجنبی ہیں اور یہ ہماری پہلی ملاقات ہے؟"

"نن......... نہیں۔" وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "دراصل میں دل کو سمجھا رہا ہوں کہ تم آ گئی ہو۔"

مومی نے جھیل کی طرف منہ گھما لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گزرنے والے اس کی حیا اور جھجک کو محسوس کریں۔ انور نے کہا۔ "میں نے تم سے مخاطب کیا ہے۔ تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔ یہ لوگ کیا کہیں گے؟"

وہ ایک طرف گھوم گیا مومی اس کے ساتھ چلنے لگی۔ انور نے اس کے ساتھ چلتے



ہوئے محسوس کیا جیسے اچانک یہ دنیا خوبصورت ہو گئی ہے۔ پہلے نظارے سادہ تھے۔ اب رنگین ہو گئے تھے۔ گھاس بالکل سبز نظر آ رہی ہے۔ پھولوں کے رنگ الگ الگ دکھائی دے رہے ہیں۔ آسمان کا عکس جھیل کے پانی کو نیلا کر رہا تھا۔ سفید راج ہنس پَر پھیلائے تیر رہے تھے ایسے میں جی چاہتا تھا کہ مومی کو ساری دنیا سے چرا کر آسمان کے عکس کی طرح اسے میں اتر جائے۔ خوشبو کی طرح پھول سے بدن میں سما جائے اور لہو کی طرح رگ رگ میں دوڑ جائے۔

مومی نے کہا۔ "آپ نے مجھے تم سے مخاطب کیا ہے۔ یعنی آپ بے تکلفی چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔ اس بے تکلفی تک پہنچنے کے لیے میں کل سے بے چین تھا۔ رات آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ میں تمہارے متعلق ہی سوچتا رہا۔"

"مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ ذرا سوچ کر بولا۔ "یوں دیکھا جائے تو تم ایسی ہی ہو جیسی دوسری حسین عورتیں ہوتی ہیں۔ بنگال میں حسن بکھرا پڑا ہے۔ تم پوچھو گی کہ میں دوسری کسی حسین عورت سے متاثر کیوں نہ ہوا؟"

"ہاں۔ یہ اہم سوال ہے۔"

"دراصل یہ دل کی بات ہے کہ یہ تم پر مائل ہوا۔ میری آنکھیں تمہارے سوا اور کوئی نظارہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ میرا دماغ صرف تمہارے لیے سوچتا ہے۔ آنکھیں دل اور دماغ تینوں متفقہ طور پر کسی ایک حسن کو پسند کر لیتے ہیں تو پھر نگاہوں کے سامنے دنیا کے تمام حسین چہرے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔"

مومی نے کہا۔ "پسند بدل بھی سکتی ہے۔ آج کے بعد میں کبھی نہیں ملوں گی تو پھر آپ کو کوئی دوسرا چہرہ پسند کرنا پڑے گا۔"

"تم مایوس کرنے والی باتیں نہ کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم جلد ہی یوں ملیں گے کہ پھر کبھی جدا نہیں ہوں گے۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ "کاش ایسا ہو سکتا۔"

وہ سرد آہ بھرتے وقت بڑی مجبور' بڑی دلکش لگی۔ انور کا دل کھنچ گیا۔ وہ اپنی زبان میں بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ بنگالی زبان شہد کی طرح میٹھی لگ رہی تھی۔ انور نے پوچھا۔ "کیا تم مجبور ہو؟"

"اپنی مجبوری کا احساس بڑھتا ہے تو میں تھک جاتی ہوں میرا سارا وجود پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا ہے۔ یہاں گھاس بہت ملائم ہے کیوں نہ ہم یہاں بیٹھ جائیں۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی ساڑھی سنبھالتے ہوئے آہستگی سے بیٹھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا' واقعی تھک گئی ہے۔ انور نے کہا۔ "تم اپنی مجبوری بتاؤ۔ شاید میں تمہارے کام آسکوں۔"

وہ قریب بیٹھ گیا۔ عجیب سلگتا ہوا حسن تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ عورت ایسی بھی ہوتی ہے کہ قریب بیٹھو تو بدن کی آنچ دیتی ہے۔ دور رہو تو یادوں کی آنچ دیتی ہے۔ مومی نے کہا۔ "میری پہلی مجبوری یہ ہے کہ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ جس کے سامنے اپنی مجبوری کا ذکر کروں۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہوگی' اگر تم مجھے اپنا ساتھی سمجھ لو........"

مومی نے پھر گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "میں ایک مدت سے ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جو کافی قد آور ہو۔ خوب اچھی صحت کا مالک ہو۔ جس کے ساتھ کھڑے ہو کر یقین ہو کہ میں ایک مرد کے ساتھ ہوں۔"

"میرا قد چھ فٹ ہے۔ صحت بہت خوب ہے۔ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہوں۔ کسی دشمن کو دبوچ لوں تو وہ میرے بازو سے نکلنے نہ پائے۔"

مومی نے اس کی پہاڑ جیسی جسامت کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ پھر کہنے لگی۔

"میں ادبی انجمنوں میں' میوزیکل فنکشنز میں اور آرٹ گیلری وغیرہ میں جایا کرتی تھی اور میری نظریں کسی ساتھی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ پھر کل میں نے آپ کو دیکھا تو جیسے سب کچھ پالیا۔ میری تلاش ختم ہوگئی۔ مگر ڈرتی ہوں۔"

"کیوں ڈرتی ہو؟"

"سوچتی ہوں پتا نہیں آپ کا مزاج کیسا ہوگا۔ آپ مجھے بدنام تو نہیں کردیں گے؟"



"میں کم ظرف نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کبھی کسی سے عشق نہیں کیا تم سے محبت ہوئی ہے تو میں تمہارے لیے جان دے سکتا ہوں اور جان کی قربانی دینے والے کسی کو بدنام نہیں کرتے۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ تم دل سے میری تمنا کر رہے ہو۔ پھر بھی ایک مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟"

"یہی کہ تم بہاری ہو۔"

"تو کیا ہوا؟ کتنی ہی بہاری عورتوں نے بنگالیوں سے اور بنگالی عورتوں نے بہاریوں سے شادی کی ہے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"ہم نہیں کر سکتے۔"

"آخر کیوں؟"

وہ ذرا ہچکچاتی رہی پھر بولی۔ "اب وقت بدل گیا ہے۔ بائیس برس میں ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکے۔ ایک دوسرے کی تہذیب کو قبول نہ کر سکے۔ اب یہ خلیج اتنی بڑھ گئی ہے کہ بہت جلد یہ بنگلہ دیش بن جائے گا جو بہاری اور پنجابی ہم پر حکومت کر رہے ہیں' انہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔"

"مومی! یہ سیاسی باتیں ہیں ہماری محبت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک دن سیاست ہماری محبت پر اثر انداز ہوگی۔ ایک بہاری سے ملتے رہنے پر میرے لوگ اعتراض کریں گے۔"

"میں بنگالی بولتا ہوں بنگالی تہذیب کو پسند کرتا ہوں بنگالی لڑکی سے محبت کر رہا ہوں۔ پھر مجھ سے دشمنی کیوں کی جائے گی؟"

"آپ جیسے ایک دو آدمیوں کے بنگالی بن جانے سے پوری بہاری قوم تو نہیں بدل جائے گی۔ بہاریوں نے خود کو ہم سے الگ رکھا ہے۔ اس لیے وہ اب الگ ہی رہیں گے۔ ان کے ساتھ آپ جیسے بھی سزا پائیں گے۔"

وہ بہت بڑے انقلاب کی پیش گوئی کر رہی تھی لیکن انور کو سیاست سے کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ وہ صرف مومی کو اپنانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو میں محبت کرنے کی سزا پاؤں گا مگر تمہاری چاہت سے باز نہیں آؤں گا۔"

"آپ جیسے ضد کر رہے ہیں ویسے ہی میرا دل آپ کے لیے ضد کر رہا ہے مگر ایک اور مجبوری ہے۔"

"وہ مجبوری کیا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئی بولی۔ "میں......... میں ابھی نہیں بتا سکتی۔"

"پھر کب بتاؤ گی۔"

"سوچوں گی" اس نے سر کو جھکا لیا۔ جیسے سوچ رہی ہو۔ انور تھوڑی دیر تک اُسے دیوانہ وار دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ اپنی کوئی کویتا (شاعری) سناؤ۔"

وہ بولی۔ "یہ درست ہے کہ شاعر اپنے دل کی چھپی ہوئی بات کو شاعری کے بہانے پیش کرتے ہیں۔ میں بھی کچھ پیش کرتی ہوں سنیے۔"

وہ ذرا سوچنے کے بعد سنانے لگی۔

"میں ایک سیپ ہوں۔
بوڑھے سمندر کے کنارے پڑی ہوں
سمندر کی بوڑھی لہریں مجھے آغوش میں نہیں لے سکتیں
میں چاہتی ہوں کہ لہریں مجھے اچھال کر
سمندر کے اندر لے جائیں......... یا
پھر دنیا دیکھے کہ
میرے اندر بھی موتی ہوتا ہے۔
ابھی تو میں......... ایک بند سیپ ہوں"

"واہ' واہ۔" انور نے لطف اندوز ہو کر کہا۔ "تم نے کتنے خوبصورت انداز میں پیاسے جذبوں کو پیش کیا ہے۔"

وہ ایک دم سے شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ساڑھی کو اِدھر اُدھر سے یوں درست کرنے لگی۔ جیسے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ انور نے کہا۔ "اب تو



بتا دو کہ تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہے؟"

اس نے سر کو جھکا لیا چپ رہی' جیسے اپنے اندر لڑ رہی ہو۔ انور نے پھر پوچھا۔ "کیا نہیں بتاؤ گی؟"

وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "میں یہاں نہیں بتا سکتی۔ کہیں تنہائی ہو تو........."

انور نے آس پاس دیکھا۔ باغ میں دور دور تک مرد' عورتیں اور بچے نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ قریب سے بھی گزر جاتے تھے۔ اس نے کہا۔ "مومی! میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں میرا کوئی مکان نہیں ہے۔ کرائے پر مکان دینے والے پوچھتے ہیں کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں۔ نہ میں نے شادی کی ہے' نہ مجھے کوئی مکان کرائے پر دیتا ہے۔"

"پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"دلکشا ہوٹل کے ایک کمرے میں۔ اس کا یومیہ کرایہ دس روپے ہے۔ یعنی میں اس کمرے کا ماہانہ تین سو روپے ادا کرتا ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں تنہائی میں تم کچھ کہہ سکو گی۔ کیا میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی۔"

اس نے ہولے سے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رات کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ وہ رمنا پارک کے باہر ایک رکشہ میں آ کر بیٹھ گئے انور نے رکشے والے کو نواب پور چلنے کے لیے کہا۔ مومی کی فرمائش پر اس نے رکشے کا ہُڈ چڑھا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی جان پہچان والا اسے دیکھے اور پہچان لے۔ اسی لیے اس نے سر پر آنچل کو گھونگٹ کی طرح رکھ لیا تھا۔ تقریباً آدھے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ انور اس کی گھبراہٹ صاف محسوس کر رہا تھا۔

نشاط سینما کی گلی کے موڑ پر دلکشا ہوٹل تھا۔ جب وہ ہوٹل پہنچے تو رات کے تاریکی پھیل گئی تھی۔ نواب پور روڈ پر قمقمے روشن تھے۔ ہوٹل کے اوپری حصے میں رہائشی کمرے تھے۔ انور کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مومی جیسی رئیس عورت اس معمولی ہوٹل کے کمرے میں آئے گی۔ وہ حیران تھا کہ مومی اتنی آزاد کیسے ہے؟ رات ہو گئی ہے۔ کیا اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ وہ اتنی دیر کہاں تھی؟ بنگالی عورتیں اتنی آزاد

نہیں ہوتیں کہ رات ہونے پر بھی گھر سے باہر رہیں۔ انور کے دماغ میں اس کے متعلق بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔

ہوٹل کے کنارے گلی میں ایک تنگ سا زینہ تھا۔ مومی' انور کے پیچھے زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر چار نمبر کے کمرے تک پہنچی۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اُسے تنگ و تاریک ہوٹل میں پہنچ کر یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ اپنے مقام سے گرنے کے لیے وہاں پہنچی ہے اور وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی کہ مجبوری ہے۔ کبھی کبھی بلندی سے پستی کی طرف گرنا اچھا لگتا ہے۔

انور نے کمرے کے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہا۔ "اس چھوٹے سے ہوٹل میں تمہیں گھٹن کا احساس ہو رہا ہو گا۔ ٹھہرو میں لائٹ آن کرتا ہوں۔"

مومی نے اندھیرے میں محسوس کیا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ وہ اندر گیا ہے' پھر سوئچ کی آواز آئی۔ کمرے کے اندر بلب روشن ہو گیا۔ "اندر آجاؤ۔"

اس نے اندر پہنچ کر دیکھا۔ ایک طرف بستر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس کے اوپر تکیے الٹے پڑے تھے۔ کھڑکی کے پاس ایزل پر ایک ادھوری تصویر رکھی ہوئی تھی۔ کلرپلیٹ پر رنگ خشک ہو رہے تھے۔ اس کے قریب میز پر بہت سے برش بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے اس کمرے کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کمرے کو دیکھ کر ایک مصور کی بے پروائی اور منتشر مزاجی کا پتا چلتا تھا۔

وہ منہ بنا کر بولی۔ "چھی چھی' تم کتنے گندے کمرے میں رہتے ہو۔"

"ہاں۔ میرا یہ کمرا تمہارے شایانِ شان نہیں ہے لیکن تم تنہائی چاہتی تھیں اس لیے میں یہاں لے آیا۔"

مومی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔ "کوئی مجھے یہاں پر دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟"

انور نے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر اسے تسلی دی۔ "اب کوئی نہیں دیکھے گا' کوئی نہیں سنے گا' اپنی مجبوری بتاؤ۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ بے ارادہ ساڑھی کے پلو سے کھیلنے لگی۔ انور نے پوچھا۔



"مومی! ایسی کیا بات ہے کہ ہم ایک نہیں ہو سکتے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر جھجکتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے سامنے کیسے زبان کھولوں؟"

"میرے سامنے شرم آرہی ہے تو لو میں بتی بجھا دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ بند کمرے میں اچانک گہری تاریکی چھا گئی۔ انور کی آواز سنائی دی۔ "میں اب تمہارے سامنے نہیں ہوں۔ تمہارے پاس صرف اندھیرا ہے' اندھیرے سے بولو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر وہ تاریکی سے بولنے لگی۔ "میں کبھی بہت ہی غریب لڑکی تھی۔ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میں چھ برس کی عمر تک کبھی دو وقت اور کبھی تین وقت کے فاقے کرتی رہی۔ میرا باپ مچھلیاں پکڑتا تھا۔ ایک بار ایسا سیلاب آیا کہ وہ مچھلیوں کے ساتھ بہہ کر کہیں نکل گیا۔ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ ماں کو یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ تب وہ مجھے اس شہر میں لے آئی۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "گرام (گاؤں) میں رہ کر میں یہ سمجھتی تھی کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف بنگالی رہتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح میں نے اپنے گرام کو ساری دنیا سمجھ لیا تھا۔ شہر آکر میں نے پہلی بار بہاریوں اور پنجابیوں کو دیکھا۔ ماں نے بتایا کہ یہ لوگ بہت امیر ہوتے ہیں اتنے امی پلنگ پر سوتے ہیں' صوفوں پر بیٹھتے ہیں۔ لاہور اور کراچی کے قیمتی کپڑے پہنتے ہیں۔ تھوڑی دور بھی جانا ہو تو رکشوں پر آتے جاتے ہیں۔ جیسے رعایا اپنے حکمرانوں سے ڈرتی ہے' اسی طرح میں ان لوگوں سے ڈرنے لگی تھی۔ ان دنوں ہم میڈیکل کالج کے پیچھے' ریلوے لائن کے کنارے شکستہ جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور بڑے گھروں میں برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرتے تھے۔ میری ماں بھی یہی کرتی تھی۔ ایک دوپہر کی بات ہے' میں اپنی ماں سے ملنے وہاں گئی۔ جہاں وہ کام کرتی تھی گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ایک کمرے کی باہری کھڑکی سے ماں کو آواز دی۔ پہلے تو خاموشی رہی پھر ماں کی آواز آئی۔ "کیا بات ہے مومنہ! کیوں آئی ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ ”تم دوپہر کا کھانا ابھی تک نہیں لائیں‘ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”تم گھر جاؤ۔ میں ابھی لے آؤں گی۔“

میں نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے مجھے بھات دو۔“

کھڑکی کے پیچھے کُھسر پُھسر سنائی دی۔ ماں کے ساتھ کسی مرد کی آواز بھی تھی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ ماں نے مجھے اندر بلا کر دروازے کو بند کر دیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں لے جا کر مجھے ایک برتن میں دال بھات اور گوشت کا سالن دیا۔ پھر بولی۔ ”یہاں بیٹھ کر کھاتی رہو۔ ادھر کمرے میں نہ آنا۔ نہیں تو وہ ماوڑا......... (بہاری پنجابی) غصہ کرے گا۔“

یہ سمجھا کر وہ پھر اسی کمرے میں چلی گئی۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی اگر وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ ہوتی‘ تب بھی یہاں کی عورتوں کو اپنی محنت کے ساتھ اپنا جسم بھی بیچنا پڑتا تھا۔ ایسا نہ کریں تو صرف سوکھی تنخواہ ملتی ہے‘ بچا ہوا کھانا نہیں ملتا۔ مالکوں کی ایکسٹرا مہربانیاں نہیں ملتیں۔ مجھے جیسے جیسے یہ معلومات حاصل ہوتی رہیں ویسے ہی ویسے آپ لوگوں سے نفرت بڑھتی رہی۔“

یہ کہہ کر وہ چپ ہوئی۔ انور نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندھیرا نفرت کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ انور نے پوچھا۔ ”اب تو نفرت نہیں ہے؟“

مومی نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے ساتواں برس لگا تو ماں نے ایک بنگالی زمیندار کے گھر میں کام پکڑ لیا۔ وہاں دو زمیندار بھائی تھے۔ وہ بہت ساری زمینیں بیچ کر پٹ سن کا کاروبار کرنے نارائن گنج آئے تھے۔ میں نے کہا نا کہ میری ماں بہت خوبصورت تھی۔ جس گھر میں عورتیں نہیں ہوتی تھیں‘ وہاں مرد لوگ فوراً میری ماں کو کام کے بہانے رکھ لیتے تھے۔ چھوٹے زمیندار نے بھی میری ماں کو دیکھتے ہی اپنے گھر کا کام اسے سونپ دیا۔ بڑے زمیندار کا نام امداد میاں تھا۔ ان دنوں اس کی عمر پچاس کے اوپر ہی ہو گی۔ سر کے بالوں اور مونچھوں پر لگا ہوا خضاب اُڑ رہا تھا۔ بڑھاپے کی



سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

ماں نے بیٹی کا رشتہ بتایا۔ امداد میاں نے میری عمر پوچھی۔ اسے عمر بتائی گئی۔ اس نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لڑکی مجھے دے دو۔ جو دام مانگو گی تمہیں ادا کر دوں گا۔“

بے شک قحطِ بنگال کے زمانے سے بچوں کو بیچ دینے کی تاریخی عادت پڑ گئی ہے۔ آج بھی بھوکوں مرنے والے ماں باپ بچوں کو اس خیال سے بیچ دیتے ہیں کہ بچے گود نکل کر جہاں بھی جائیں گے‘ بھوکے ننگے نہیں رہیں گے۔ ایسی ممتا سے کیا حاصل‘ جو بچوں کو ترسا ترسا کر مار ڈالے مگر میری ماں نے گھبرا کر مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ امداد میاں سے بولی۔ ”میں اپنی بچی کو دو وقت کھلا سکتی ہوں۔ میں اسے نہیں بیچوں گی۔“

”تمہاری مرضی تم اس کی ماں ہو۔“

دونوں بھائیوں نے ماں کو مجبور نہیں کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امداد میاں کا چھوٹا بھائی میری ماں کو کمرہ بند کرنے کے بعد سمجھایا کرتا تھا کہ اس کے دادو (امداد میاں) کے پاس رہنے سے مومنہ کی زندگی سنور جائے گی۔ اچھا کھانا‘ اچھا کپڑا‘ اور اچھی تعلیم بھی دی جائے گی۔ میری ماں یہ سب کچھ میرے لیے کرنا چاہتی تھی مگر وہ بولی۔ ”میری مومنہ ابھی سات برس کی بھی نہیں ہوئی اور آپ کے دادو ساٹھ برس کے لگتے ہیں۔ میری بچی تو بالکل بچی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ جب تک وہ جوان نہیں ہو گی۔ دادو اسے بیوی نہیں بنائیں گے۔“

”تو پھر اسے جوان ہونے دیں۔“

چھوٹے زمیندار نے کہا۔ ”دادو بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی پیش گوئی ہے کہ تمہاری بیٹی جوان ہو کر ایسی غضب کی عورت ہو گی کہ کوئی بھی بدمعاش تمہاری جھونپڑی سے اٹھا کر لے جائے گا۔ یا پھر تم دوسرے کے گھروں میں اپنی طرح کام کرنے کے لیے بھیجو گی اور اپنی ہی طرح اس کی جوانی کو بھی ستا کھلونا بنا دو گی۔ عقل سے سوچو اور مومنہ کو دادو کے حوالے کر دو۔“

ماں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں مانتی ہوں' عقل کی بات سمجھا رہے ہو۔ چند برسوں کے بعد مومنہ ایسی دولت بن جائے گی جسے میں چوروں سے نہیں بچا کر رکھ سکوں گی۔ مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے۔ مگر مجھے اس بات کی ضمانت چاہیے کہ مومنہ کو ایک نوکرانی کی بیٹی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کی عمر سے زیادہ اس پر کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دادو سے کوئی ضمانت طلب کروں گا۔"

دوسرے دن دادو یعنی امداد میاں نے خود ماں کو بلا کر کہا۔ "اس سے بڑی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ میں تمہاری بیٹی سے ابھی نکاح پڑھوا لوں گا۔"

ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ "اتنی سی عمر میں مومنہ کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" امداد میاں نے کہا۔ "کیا ہماری لوک کہانی میں روپ بان نے ایک دودھ پیتے بچے سے شادی نہیں کی تھی؟ کیا ہمارے ہاں بچپن میں شادی کا رواج نہیں ہے؟"

ماں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں ایسا تو ہوتا ہے مگر........"

"مگر کیا؟ میں مومنہ کو مہر کے طور پر پانچ سو روپے ادا کر دوں گا۔"

"پانچ سو روپے!" ماں کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ ہماری سات پشتوں میں بھی کسی نے یکمشت پانچ سو روپے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے منہ تکنے لگی۔ امداد میاں نے کہا۔ "آج شام کو میں ایک سرخ جوڑا دوں گا۔ تم یہاں مومنہ کو دلہن بنا دینا قاضی آکر نکاح پڑھائے گا۔ نکاح نامے پر مہر کی رقم پانچ سو روپے لکھائی جائے گی۔ تم نکاح نامہ رکھ لینا۔ میں مومنہ کو اپنے پاس رکھ لوں گا۔"

ماں راضی ہو گئی۔ اس رات میں دلہن بن کر امداد میاں کی سیج پر پہنچ گئی۔ میں اچھی طرح نہیں سمجھ رہی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مگر دلہن بن کر بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنے کپڑے ایک ساتھ پہنے تھے۔ ساٹن کا سُرخ جوڑا تھا اور بہت سے زیورات میرے بدن پر تھے۔ میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ یہ میرے لیے گڑیا گڈے کا کھیل تھا۔ پھر پتا نہیں کتنی دیر کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے۔"



انور اندھیرے میں گم صم کھڑا ہوا تھا۔ مومی غائب تھی مگر اس کی آواز کانوں میں اتر رہی تھی۔ وہ امداد میاں کے متعلق کہہ رہی تھی۔ کہ وہ کمرے میں آئے تھے۔ کیا مومی نے سات برس کی عمر میں امداد میاں کو قبول کر لیا تھا؟ کوئی بھی لڑکی قبول کرنے کے بعد ہی اپنے مرد کو وہ کہتی ہے۔

انور نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "مگر مومی! تم تو بالکل بچی تھیں؟"

"ہاں۔ بعد میں عقل آئی تو سوچا کہ امداد میاں جیسے بوڑھے لوگ مجھ جیسی لڑکیوں کو بیٹی بناتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بیوی بنایا تھا اور میرے بچپن کو خوش کرنے کے لیے مجھے سہاگ کی سیج پر دلہن بنا کر بٹھا دیا تھا۔ وہ میرے پاس آکر بولے۔ "ہائے تم کتنی سندر ہو۔ دلہن بن کر تو اور غضب ڈھا رہی ہو۔ کاش' اس وقت اچانک تمہاری عمر بڑھ جائے اور میری عمر گھٹ جائے آہ مگر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں چپ چاپ ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ جلدی سے بولے۔ "تم مجھے ایسے نہ دیکھو۔ میں بوڑھا نہیں ہوں۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں تمہارے جوان ہونے تک جوان رہوں گا۔"

انہوں نے باتوں کے دوران میرے زیورات اتار دیے۔ مجھ سے کہا۔ "تمہاری ماں بتا رہی تھی کہ تم جلدی سو جاتی ہو۔ آؤ میں تمہیں سلا دوں۔"

میں بستر پر لیٹ گئی۔ وہ میرے پاس لیٹ کر مجھے سینے سے لگا کر تھپکنے لگے۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ اس رات مجھے کس قدر سکون مل رہا تھا۔ وہ مجھے سہلا رہے تھے اور دھیرے دھیرے گنگنا رہے تھے۔ پھر پتا نہیں میں کب سو گئی۔ مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ جب محبت اور شفقت روپ بدل کر ملتی ہے تو پچھلی محبتوں کی جدائی کا صدمہ دھیما پڑ جاتا ہے۔

دوسرے دن سے میرے لیے ایک گورنس کا انتظام کیا گیا۔ وہ مجھے پڑھاتی تھی۔ اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' کھانے پینے اور پہننے کا سلیقہ سکھاتی تھی۔ دس برس کی عمر تک نے بنگالی اور انگریزی کی چھ جماعتوں والی کتابیں ختم کر دیں۔ گورنس بہت ذہین تھی۔ اس کی ذہانت مجھے ملی۔ وہ مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی تھی۔ اس کی زبان سے اخلاق اور تہذیب کی باتیں سن کر میں نے امداد میاں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونے سے انکار کر

دیا۔ پہلے تو وہ بڑے تلملائے، بڑی ضد کی، مگر میں ان سے زیادہ ضدی ہوں۔ آخر وہ مان گئے کہ اپنے وقت سے پہلے قدرت مہربان نہیں ہو سکتی۔

بارہ برس کی عمر میں علمی ذہانت کے پیشِ نظر گورنس نے مجھے شاعری یا افسانہ نگاری کا مشورہ دیا۔ میں نے اس مشورے پر عمل کرنا شروع کیا تو میرے اندر کی شاعرہ بیدار ہونے لگی۔ عشق و محبت کے جذبات نے ایک ایسا آئیڈیل میرے دماغ میں بسا دیا جو نوجوان اور خوبرو ہونے کے علاوہ صحت مند اور قد آور تھا۔ جب میں کوئی شعر کہنا چاہتی تو پہلے اسے تصور میں بلا لیتی۔ جب وہ آتا تو میں شرمانے لگتی۔ اس سے چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تو میں اسی کے بازوؤں میں خود کو اس سے چھپا لیتی۔ ایسے ہی خیالی رومانس میں میری شاعری جوان ہونے لگی۔ امداد میاں کو ایک دن پتا چل گیا کہ میں جوان ہو چکی ہوں۔

گورنس کی توجہ اور تعلیم نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں ایک خیالی شہزادے سے محبت کرتی تھی۔ مگر مجھے امداد میاں سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلائی تھی۔ میں جھونپڑیوں اور فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح زندگی گزارتی تھی۔ انہوں نے مجھے انسان بنا دیا تھا۔ زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ ان احسانات کے علاوہ میں آٹھ برس سے ان کے قریب رہتی آئی تھی۔ اب ان کی قربت کی عادی ہو گئی تھی۔ ان کی محبت اور شفقت کی محتاج ہو گئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد امداد میاں ایک ایسے بزرگ رہ گئے تھے جن کے سائے میں گزری ہوئی محبتیں مل جاتی تھیں اور وہ میرے مجازی خدا بھی تھے۔ آئندہ بھی ان سے ہی محبتیں ملنے والی تھیں۔

۲۵ مارچ کو امداد میاں نے ہماری شادی کی سالگرہ بڑی ہی دھوم دھام سے منائی۔
ان کے تمام رشتے دار اور دوست احباب یہ جانتے تھے کہ امداد میاں نے سات برس کی ایک بچی سے نکاح پڑھایا تھا۔ اگرچہ ایسا نکاح جائز نہیں ہوتا مگر قاضی نے پیسوں کے زور پر سات برس کی جگہ سترہ برس لکھ دیا تھا۔ جو لوگ مجھے بچی سمجھتے تھے، ان لوگوں نے سالگرہ کے دن مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتی کہ میرے حسن و شباب اور قیمتی زیورات کی چمک دمک نے لوگوں کو کتنا متاثر کیا۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ



امداد میاں تعریفیں سن سن کر فخر سے اکڑے جا رہے تھے۔ خوشی کے مارے کچھ بوکھلائے ہوئے بھی تھے۔ مہمانوں کے سامنے بار بار میرا ہاتھ پکڑ لیتے تھے، جیسے سہارا تلاش کر رہے ہوں، جیسے گر پڑنے کا ڈر ہو۔ میں نے کئی بار انہیں ڈگمگاتے دیکھا۔ کئی بار سرگوشیوں میں مشورہ دیا کہ وہ ایک جگہ بیٹھ جائیں۔ مگر وہ سینہ تان کر چلتے ہوئے خود کو جوان ثابت کرتے رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بالوں میں خضاب لگا رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں زکام ہو گیا تھا۔

رات کو تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ میرے لیے امداد میاں کی خواب گاہ کو سجایا گیا تھا۔ میں جس بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اس پر پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جب وہ کمرے میں آئے تو میں نے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ میں تصور میں کسی نوجوان شہزادے کو دیکھ رہی تھی اور سامنے امداد میاں آ کر میرا گھونگھٹ الٹ رہے تھے اور زکام کی وجہ سے چھینک رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ گھونگھٹ اٹھاتے وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں میرے حسن کا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس رات میں انہیں بڑی دیر تک ہانپتے کانپتے دیکھتی رہی۔ کبھی وہ چھینکتے اور ناک صاف کرتے رہے۔ کبھی کہتے کہ زکام سے سر چکرا رہا ہے۔ آخر تھک ہار کر کہا۔ ”تمہیں سونا چاہیے۔ ورنہ میرے چھینکتے رہنے سے تمہیں بھی زکام ہو جائے گا۔“

میں کچھ دیر تک منہ چھپا کے بیٹھی رہی۔ امداد میاں نے ایک بار پھر مجھے دوسرے کمرے میں جا کر سونے کے لیے کہا۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ کیونکہ بند آنکھوں کے پیچھے مجھے وہ خیالی شہزادہ نظر آ رہا تھا۔“

تاریکی گہری تاریکی تھی۔ ہوٹل کے تاریک کمرے میں موی گم ہو گئی تھی۔ اس کی آواز بھی گم ہو گئی تھی۔ اپنی روداد کے اس موڑ پر آگے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ البتہ انور کی نگاہوں کے سامنے دور بہت دور جھیل کا کنارہ تھا اور ایک شاعرہ الفاظ کے درد میں کہہ رہی تھی۔

میں ایک بند سیپ ہوں۔
بوڑھے سمندر کے کنارے پڑی ہوں
سمندر کی بوڑھی لہریں مجھے آغوش میں نہیں لے سکتیں
میں چاہتی ہوں کہ لہریں مجھے اچھال کر
سمندر کے اندر لے جائیں.........یا
پھر دنیا دیکھے کہ
میرے اندر بھی موتی ہوتا ہے۔
ابھی تو میں......... ایک بند سیپ ہوں۔"

بند کمرے میں روشنی نام کو نہیں تھی گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کسی کا وجود نہ ہو۔ اندھیرے نے آگے بڑھ کر تاریکی کو چھو لیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ جیسے سہارا چاہتی ہو۔ اندھیرے نے اسے تھام لیا۔

"میں زندگی بھر تمہارا ساتھ دوں گا۔ جو ساتھ نہ دے سکے اسے چھوڑ کر آجاؤ۔"

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر کوئی ساتھ نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں......... اتنی محبت کرتے ہیں کہ میرے بغیر رہ نہیں سکتے۔"

"اور تم؟"

"میں بھی ان سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ انہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اور میں؟"

"تم۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "تم میری تلاش کا حاصل ہو۔ میں دو برس سے بھٹک رہی ہوں۔ دور ہی دور سے کسی نہ کسی کو دیکھ کر سوچتی رہی کہ کسی کو اپنا ساتھی بنالوں۔ پھر ڈر لگتا تھا کہ پتا نہیں وہ ساتھی تمام عمر راز دار بن کر رہے گا یا نہیں؟"

"تم نے مجھ پر کیسے بھروسہ کرلیا؟"

"میں تلاش کرتے کرتے' سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے تھک گئی ہوں۔ میں نے



سوچ لیا کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے آج بہت بڑا جوا کھیلنے آگئی ہوں۔ میں اپنے آپ کو داؤ پر لگا رہی ہوں اگر تم نے مجھے کوئی سستی بازاری عورت سمجھا تو میں ذلت کے اس احساس سے مرجاؤں گی۔"

"موی! تم بہت اونچی عورت ہو۔ اس مقام پر پہنچ کر بھی اپنے شوہر کا دم بھر رہی ہو۔ مانا کہ تم مجھے مل رہی ہو۔ مگر تمہاری محبت نہیں مل رہی ہے۔ اس لحاظ سے تم سستی نہیں۔ اس محبت کی طرح مہنگی ہو' جو مجھے نہیں مل سکتی۔"

انور نے اچانک محسوس کیا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے' ہولے ہولے سسکیاں لے رہی ہے۔ اس عورت کے پاس عزت تھی' شرافت تھی اور شرم تھی اور یہی چیزیں اسے رُلا رہی تھیں بعض حالات میں انسان اپنی مرضی سے سودا کرکے روتا ہے۔

☆======☆======☆

رات کے گیارہ بجے وہ اپنے کوٹھی کے دروازے پر پہنچی تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ بہت زیادہ تھک جانے سے بھی بدن ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سیدھی اپنے کمرے میں جائے اور بستر پر ایسی گرے کہ صبح تک نہ اٹھے۔

مگر وہ سیدھی اپنے کمرے میں نہ جا سکی۔ ڈرائنگ روم میں امداد میاں ایک صوفے پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی مونچھوں کے اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ اچھا قد آور تھا۔ معلوم ہوتا تھا' جوانی میں خوب صحت مند اور بھاری بھرکم رہا ہوگا۔ مگر اب اس کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ دبلا پتلا لانبے بانس کی طرح لگتا تھا۔

اس نے موی کو دیکھتے ہی پیار سے پوچھا۔ "کہاں رہ گئی تھیں گیارہ بج چکے ہیں؟"

وہ ساڑھی کے پلو کو شانے پر درست کرتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پھر تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ آج پہلی بار اتنی دیر ہوگئی۔ فلم بہت اچھی تھی۔"

امداد میاں اسے غور سے دیکھ رہے تھا۔ موی پھر ایک بار ساڑھی کو ادھر ادھر سے یوں درست کرنے لگی جیسے اپنے آپ کو چھپا رہی ہو۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں سے ظاہر

نہ ہو جائے۔ امداد میاں نے کہا۔ "تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی؟"

"نہیں نیند آرہی ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے اکثر راتوں کو اٹھ کر دیکھا ہے' تم جاگتی رہتی ہو۔"

وہ بھی صوفے سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "آج خوب نیند آرہی ہے۔ آج میں سو جاؤں گی۔"

اس نے امداد میاں کے بازو کو پیار سے تھام لیا۔ پھر اس کے ساتھ خواب گاہ کی طرف چلتی ہوئی بولی۔ "آپ کتنے اچھے ہیں۔ میرے لیے ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔"

"ہاں۔ پہلے میں آپ کو سلاؤں گی پھر خود سونے جاؤں گی۔"

وہ خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ وہاں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے دونوں پلنگ ایک دوسرے سے ذرا دور تھے۔ امداد میاں نے اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں خود ہی سو جاؤں گا۔ تم میرے لیے نہ جاگو۔"

"چلئے لیٹ جائیے۔ آپ کے لیے جاگنا میرے لیے عین راحت ہے۔"

وہ بستر پر لیٹ گیا۔ مومی سوئچ بورڈ کے پاس گئی۔ اس نے زیرو پاور کے بلب کو آن کر کے دوسری بتیاں بجھا دیں۔ خواب آور دھیمی روشنی میں وہ کمرہ بڑا پُراسرار اور رومان پرور لگتا تھا۔ امداد میاں کا مومی شعلے کی طرح نظر آتی تھی۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ اس رات بھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ مومی آچکی ہے۔ اس کا یہ معمول تھا کہ ہر رات امداد میاں کا سر اپنے سینے سے لگا کر سہلاتی تھی اور گنگناتے ہوئے اسے سلا دیتی تھی۔

امداد میاں آنکھیں بند کر کے چپ سادھ لیتا تھا۔ اسے یہ احساسِ جرم ستاتا اور جگاتا تھا کہ میں نے ایک عورت کی جوانی میں اس کی نیندیں اڑا دی تھیں اور وہ ایسی وفادار اور ایسی محبت کرنے والی بیوی تھی کہ جس کی مثال مشرقی ملکوں میں ہی ملتی ہے۔

مومی نے اس کے سر کو ایک بازو میں لیا' جیسے وہ بچہ ہو پھر وہ سر کو اپنے سینے سے لگا



کر سہلانے اور گنگنانے لگی۔ امداد میاں نے کہا۔ "مومی! آج اپنی کویتا سناؤ۔"

وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر گنگناتے ہوئے سنانے لگی۔

"سردی شباب پر ہے۔
انگیٹھی میں آگ نہیں ہے' اور
میں ٹھنڈ سے کانپ رہی ہوں
میرے ساتھی! کیا تمہارے پاس دیا سلائی ہے؟
آؤ' انگیٹھی کو انگاروں سے بھر دو
نہیں' دیا سلائی نم ہوگئی ہے
مجھے سردی لگ رہی ہے
اپنی ضرورت کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔
میں اپنے پڑوسی سے آگ مانگ کر لے آئی ہوں۔
اب انگیٹھی دہک رہی ہے۔
کمرہ گرم ہوگیا ہے۔
میرے ساتھی آؤ' میں تمہیں سُلا دوں۔"

امداد میاں کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر ذہن جاگ رہا تھا۔ مومی کی کویتا سُن کر اسے سردی کا احساس ہوا۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "مومی! ایک بات بتاؤ گی؟"

"جی ہاں۔ پوچھئے۔"

"وہ آرٹسٹ آج بھی ملا تھا؟"

"ایں۔ وہ ہاں۔ جی ہاں ملا تھا۔"

"کیا اسی نے فلم دکھائی تھی؟"

وہ چپ رہی' کچھ بول نہ سکی۔ زیرو پاور کی روشنی میں کسی کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ مومی نے اس کے چہرے کو اپنے سینے میں ذرا اور چھپالیا تاکہ امداد میاں اسے نہ پڑھ سکے۔ وہ بولا۔ "میں نے تمہیں آزادی دی ہے۔ کبھی تم سے نہیں پوچھا کہ تم کہاں جاتی ہو؟ اور کن لوگوں سے ملتی ہو؟ لیکن کل تم ہی نے بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ بھاری

ہے۔"

"جی ہاں مگر وہ بہاری نہیں لگتا۔"

"اکثر بدمعاش اوپر سے بدمعاش نہیں لگتے۔"

"وہ......... وہ بہت اچھا ہے۔"

"ہوں۔ وہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

وہ ذرا ہچکچائی پھر بولی۔ "کس ملک میں اور کس قوم میں بدمعاش نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی قوم کے لوگوں کی بدمعاشیاں چھپا کر صرف اچھائیاں پیش کریں اور ایک باوصف اعلیٰ ظرف قوم کی تاریخ مرتب کریں۔ اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اپنا اصلی چہرہ چھپانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہماری قوم میں آئندہ بدمعاش پیدا نہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ مگر بنگالیوں میں بدمعاش کم ہوتے ہیں۔"

"کم سہی، مگر ہوتے ہیں۔"

"تم اس بہاری کی حمایت میں بول رہی ہو۔ میں سمجھ گیا' تم اسے پسند کرنے لگی ہو۔"

"وہ ایک اچھا آرٹسٹ ہے۔"

"صرف ایک اچھا آرٹسٹ ہے؟"

"اس کی سوچ بھی اچھی ہے۔"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔ پھر امداد میاں نے بچوں جیسا سوال کیا۔ "اس نے جو فلم تمہیں دکھائی' کیا بہت اچھی تھی؟"

وہ جواب سوچتی رہی۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "بہت۔ اچھی تھی۔ میں نے آج سے پہلے ایسی فلم نہیں دیکھی۔ بس اب آپ سوجائیں۔"

"مومی! ملک کے حالات بگڑتے جارہے ہیں۔ ایسے میں تم اس سے ملتی رہوگی تو ہمارے لوگ کیا کہیں گے؟"



"یہ سوچ کر میں ڈر رہی ہوں۔"

"ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "میں تمہیں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اس طرح کہ ہماری نیک نامی خطرے میں نہ پڑے۔ میں تمہاری آزادی میں مخل نہیں ہوں گا۔ تمہاری دوستی پر اعتراض نہیں کروں گا۔ مگر کسی کو اس دوستی کا علم نہ ہو تو بہتر ہے۔"

مومی اسی لیے امداد میاں پر جان دیتی تھی کہ وہ شکی نہیں تھا۔ اگر ہو بھی تو بڑی فراخدلی سے شک و شبہات کو اپنے اندر کچل دیتا تھا۔ وہ بولی۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ ہماری دوستی دو فنکاروں کی دوستی ہے۔"

دوستی کی بات پر مومی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا' اور امداد میاں کا سر اس کے دل کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ یقیناً دھڑکنیں کچھ چغلی کھا رہی ہوں گی۔ وہ ذرا الگ ہو کر اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ "اب آپ سوجائیں۔"

"میں دوسری طرف کروٹ بدل کر سونا چاہتا ہوں۔ اب تم اپنے بستر پر جاؤ۔ بہت رات ہوچکی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے گھوم کر دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ مومی نے چند لمحوں تک اسے دیکھا پھر اسے تھپک کر اپنے پلنگ پر چلی گئی۔

رات جانے لگی۔ امداد میاں کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ اگر یہ شبہ ہوجائے کہ کسی نے اپنی دولت کو تھوڑا سا خرچ کیا ہے تو برداشت نہیں ہوتا۔ امداد میاں خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر تھوڑا سا لٹا کر ساری دولت کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جاسکتا ہے تو تھوڑا سا نقصان برداشت کرنا چاہیے۔ اگر اپنے گھر اور اپنی عزت کا بھرم رہ جاتا ہے تو چپ چاپ ذرا سا غنڈہ ٹیکس ادا کرنے میں ہرج نہیں ہے۔

امداد میاں کو مومی سے ایسی محبت تھی جیسے آنکھ کو نیند سے اور دماغ کو بیداری سے ہوتی ہے۔ مومی بیوی تھی اور بڑھاپے میں جوان بیوی کو بس میں رکھنا ایسا ہی تھا جیسے ٹمٹماتا ہوا چراغ منہ زور آندھی کو اپنے بس میں رکھ کر روشن رہنا چاہے۔ اس عمر میں جوان عورت چھوڑ کر چلی جائے تو عزیز و اقارب' دوست احباب کے طعنے برداشت نہیں

ہوتے۔ امداد میاں کو بیک وقت کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ایک تو محبت تھی۔ دوسرے عزت کا خیال تھا۔ تیسرے یہ فکر تھی کہ اسے کس طرح بس میں رکھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے مومی کو بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا اور ساتھ ہی اسے اتنی محبت اور توجہ دیتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سے مل بیٹھ کر باتیں تو کر سکتی تھی۔ مگر اس سے متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر متاثر ہو بھی جاتی تو محبت کرنے والے بوڑھے کا ساتھ چھوڑتے وقت اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا۔

وہ دوسری طرف کروٹ بدلنے کے بعد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ آج اسے یقین تھا کہ مومی کسی دوسری شخصیت سے متاثر ہو گئی ہے۔ اب اور ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک طرف اس پر اور زیادہ مہربان ہو اور دوسری طرف اس کی آزادی کو اپنی مٹھی میں رکھے۔ اس بوڑھے نے بڑی عمر گزاری تھی بڑی دنیا دیکھی تھی۔ اس لیے اس کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ مومی کو جیتنے میں وہ آرٹسٹ سبقت نہ لے جائے۔

اس نے کروٹ بدل کر مومی کو دیکھا۔ وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس نے آہستگی سے آواز دی۔ "مومی!"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے اپنے بستر سے اٹھ کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر پورے بستر پر ہاتھ پاؤں پھیلائے ایسی گہری نیند سو رہی تھی جیسے میلوں دور سے چلتے چلتے منزل پر پہنچ کر اپنی تھکن نکال رہی ہو' امداد میاں نے پہلی بار اسے یوں بے سُدھ ہو کر سوتے دیکھا تھا۔

دوسری صبح وہ دیر تک سوتی رہی ناشتے کی میز پر وہ تنہا رہا۔ یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ آج مومی دور ہو گئی ہے۔ اس نے گہری نیند سونے کا نسخہ پا لیا ہے۔ وہ بیدار ہوئی تو شرمندہ سی تھی۔ اپنی نیند پر حیرانی کا اظہار کیا کہ جانے کیوں وہ اتنی دیر تک سوتی رہی۔ انجان بننے سے کیا ہوتا ہے۔ ایک ذرا سی دوری تو ہو ہی گئی تھی۔

امداد میاں نے پریشان ہو کر کہا۔ "میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔"

"تدبیر؟ کیسی تدبیر؟"

"تم اس آرٹسٹ کو یہاں لے آؤ۔ مجھ سے تعارف کراؤ۔"



"آ......... آپ......... اس سے ملیں گے؟ یہ......... مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"تم نادان ہو۔ میں جہاندیدہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ دنیا والوں کا منہ کیسے بند کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"میں اسے اپنا دوست یا دور کا رشتے دار بنا لوں گا۔ میرے رشتے سے تم اس سے ملو گی' باتیں کرو گی تو دنیا ہمیں بدنام نہیں کرے گی۔"

"مگر ہم کتنے لوگوں کو بتاتے پھریں گے کہ وہ آپ کا کوئی عزیز ہے۔"

"کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ہماری کوٹھی میں رہا کرے گا تو دنیا دیکھے گی۔"

مومی نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "وہ......... اور ہماری کوٹھی میں رہے گا؟"

"ہاں میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں تمہاری خوشی کے لیے اس آرٹسٹ کو خرید سکتا ہوں۔ یہاں اس کو رکھ کر اس کے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔"

"لیکن آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑی مشکل سے سانس لے کر بولا۔ "تاکہ تمہاری دوستی اس کوٹھی کی چار دیواری تک محدود رہے۔ میں کوٹھی کے باہر دوستوں اور رشتے داروں کو بتاؤں گا کہ وہ آرٹسٹ میرے ایک بہت پرانے دوست کا لڑکا ہے۔ کلکتہ کا بنگالی ہے۔ یہاں بہت عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی ہماری کوٹھی میں آکر رہتا ہے۔ ویسے اس کی رہائش کہاں ہے؟"

"وہ تنہا ہے اور ایک ہوٹل کے کمرے میں برسوں سے رہتا آ رہا ہے۔"

"پھر تو یہ بہت آسان ہو گیا۔ ہم اسے رہنے کے لیے اپنی انیکسی دے دیں گے تصویریں بنانے کے لیے بھی یہاں کا ماحول بہتر ہے' بولو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ مگر یہ سب کچھ مجھے خواب جیسا لگتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں نہیں دے سکتا؟"

"ایں۔ نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنی حیثیت کو یاد رکھتی ہوں۔ میں ایک پتھر

تھی' آپ نے تراش کر ہیرا بنا دیا۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں' آئندہ بھی آپ اتنا کچھ کریں گے جس کی توقع نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر جاؤ اور ابھی اس آرٹسٹ کو بلا کر لے آؤ۔"

"وہ اس وقت کہاں ہو گا؟ میں نہیں جانتی۔ ہاں شام کو ملنے کا وعدہ ہے۔"

"وعدہ!" وہ سوچنے لگا۔ یہی تو میں نہیں چاہتا کہ باہر ملنے کے وعدے ہوتے رہیں۔ عورت پہلے بدنامی سے ڈرتی ہے' بدنام ہونے لگے تو ڈھیٹ بن جاتی ہے۔ اسے عشق کی نیک نامی سمجھ کر عاشق کے ساتھ فرار بھی ہو سکتی ہے۔

وہ مومی کو تکنے لگا۔ مومی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ آپ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "مومی اس بڑھاپے میں میرے پاس صرف ایک ہی پونجی رہ گئی ہے اور وہ ہے تمہاری محبت۔ میری دولت اور جائداد کوئی مجھ سے چھین نہیں سکے گا۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی تمہیں بھی مجھ سے نہیں چھینے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ بولی۔ "میری محبت' میری وفا صرف آپ کے لیے ہے۔ یہ میں کسی کو نہیں دوں گی دنیا کا کوئی شخص مجھے آپ سے کبھی نہیں چھین سکے گا۔"

زبان سے محبت کا اظہار ہو تو بات زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی مگر ایسا کہتے وقت مومی کی آنکھوں میں محبت کی گہری سنجیدگی تھی۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں کہتیں۔ وہ دل کی سچائی سے کہہ رہی تھی۔ امداد میاں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یقین کرتے ہوئے کہا۔ "شام کو جاؤ گی تو جلدی آجانا۔ میں تمہارا اور اس آرٹسٹ کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

اس نے جلدی واپس آنے کا وعدہ کیا۔ شام کو دلکشا ہوٹل پہنچی تو انور سے سامنا کرنے کے خیال سے دل دھڑک رہا تھا۔ قدم ڈگمگانا چاہتے تھے مگر وہ سنبھل رہی تھی۔ اس نوجوانی میں وہ آسمان پر کمند ڈال کر چڑھ سکتی تھی لیکن ہوٹل کی مختصر سی سیڑھیاں چڑھتے وقت ہانپ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مومی کو گندگی پسند نہیں تھی۔ اس لیے انور کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بولا۔ "تم وعدہ کی پابند



ہو۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا' آؤ۔"

"مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ میرے شوہر تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"چلوں گا اندر تو آؤ۔"

وہ چند لمحوں تک کشمکش میں مبتلا رہی پھر امداد میاں سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔ وہ بولی۔ "مم۔ میں اندر نہیں آؤں گی۔"

"جان! آجاؤ" یہ کہتے ہی اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

☆======☆======☆

امداد میاں کی گھڑی میں شام کے چھ بج رہے تھے۔ مومی پانچ بجے گئی تھی۔ اسے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ اپنی کار میں نہیں گئی تھی۔ ڈرائیور کو وہ جگہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور رکشا ٹیکسی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ گھڑی میں سات بجنے لگے تو امداد میاں کی بے چینی بڑھ گئی۔ وہ کئی بار کوٹھی سے باہر باغیچے میں آیا۔ بڑھاپے میں شام کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر کوٹھی میں واپس چلا جاتا تھا کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھتا تھا مگر وہ نظر نہیں آئی تھی۔

دل میں اندیشے گھر کرنے لگے۔ اگر وہ آرٹسٹ کے ساتھ بھاگ جائے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ برسوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ابھی تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مومی کو اس بوڑھے نے جوانوں سے زیادہ خوش رکھا ہے۔ ابھی بڑھاپے کے باوجود جوانی کا بھرم قائم تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آہ۔ مومی! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ' آجاؤ۔"

رات کے آٹھ بجے کوٹھی کے سامنے ٹیکسی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مومی ایک شخص کے پاس کھڑی تھی۔ وہ شخص ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر رہا تھا۔ اسے مومی کو دیکھ کر اطمینان اور خوشی تو ہوئی مگر وہ منہ پھیلا کر خواب گاہ میں چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد مومی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

"میں جانتی ہوں' آپ ناراض ہیں۔" وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ "مگر میری مجبوری بھی سن لیجے۔ آج انور کی تصویروں کی نمائش کا آخری دن تھا۔ آرٹ گیلری میں انور کی موجودگی ضروری تھی۔ اس لیے ہمیں دیر ہو گئی۔"

بڑا معقول بہانہ تھا۔ امداد میاں کو اطمینان ہو گیا۔ مگر وہ بدستور منہ پھلا کر بولا۔

"میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اب تم مجھے تنہا چھوڑنے لگی ہو۔"

مومی نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے پچکار کر کہا۔ "میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔ آیئے ڈرائنگ روم میں انور صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"آپ جائیں گے۔ آپ بہت اچھے ہیں میری بات مان لیتے ہیں۔ ہیں نا؟"

وہ سمجھا منا کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ وہاں دو مردوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ ان میں ایک بوڑھا تھا۔ دوسرا جوان اور ان کے سامنے ایک عورت اپنے سر پر آنچل رکھ رہی تھی۔ تینوں کے درمیان شرم کا پردہ حائل تھا۔ وہ جس قوم سے بھی تھے' ان کی تہذیب اور شرافت سمجھاتی تھی کہ اگر کوئی بدمعاشی مجبوراً ہوتی رہے تو بدمعاشوں کی طرح آپس میں اس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے' بلکہ شریفوں کی طرح اسے شرم کے پردے میں چھپالینا چاہیے۔

مومی ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے بعد کچن میں چلی گئی۔ بنگالی عورتیں خواہ کتنی ہی مالدار ہوں' وہ گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی ہیں۔ مومی رات کا کھانا' دوپہر کو پکا کر گئی تھی۔ وہ کھانا گرم کرنے کے بعد ڈائننگ روم میں لے آئی۔ پھر تینوں وہاں بیٹھ کر کھانے لگے۔ اس وقت تک انور میاں اور امداد میاں کے درمیان یہ خوشگوار مسئلہ طے ہو گیا تھا کہ انور اچھے ماحول میں تصویریں بنانے کے لیے انیکسی میں آکر رہے گا اور جب چاہے گا اپنی انیکسی میں مومی کی کویتا سنے گا۔ اس طرح دنیا دو فنکاروں کو بدنام نہیں کرے گی۔ اصل فنکار امداد میاں تھا جس نے بڑی فنکاری سے یہ مسئلہ حل کیا تھا۔



انور دوسرے دن ہوٹل سے تمام سامان سمیت کر انیکسی میں لے آیا۔ اگرچہ کسی ہاں مستقل رہنا اور کھانا پینا بالکل ہی نامناسب تھا مگر مومی نے ناراض ہونے کی حد ضد کی تھی اور مومی ایسی چیز تھی' جسے پا کر وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اسے بسی میں آکر رہنا پڑا ویسے بھی حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اس کے وہاں پہنچنے کے چند روز رہی ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ پتا چلا کہ سیکڑوں بہاری عورتیں اور بچے میمن لھ سے بیوہ اور یتیم ہو کر آرہے تھے۔ کچھ روز بعد اس سے زیادہ ہولناک خبر یہ ملی کہ بناج پور اور سانتا یار میں اردو بولنے والے ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ تب الات معمول پر لانے کے لیے پاکستانی فوج کو میدانِ عمل میں آنا پڑا۔

جلد ہی وقتی طور پر امن و امان قائم ہو گیا۔ پاکستانی فوج بیرکوں میں واپس گئی تو اردو ولنے والے مشتعل ہو گئے۔ کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے عزیز و اقارب مارے گئے تھے۔ کسی بھی قوم کا کوئی شریف آدمی قتل و غارتگری نہیں چاہتا۔ ایسے وقت غنڈے بدمعاش ہنگامے کرتے ہیں۔ بہاری بدمعاشوں نے بھی یہی کیا۔ کہیں قتل اور کہیں لوٹ مار شروع کر دی۔

امداد میاں پریشان تھا۔ ایک تو گھر سے باہر بہاریوں سے خطرہ تھا۔ دوسرے گھر کے اندر ایک بہاری محبت سے انہیں لوٹ رہا تھا۔ مومی امداد میاں کے گلے کا ہار بنی رہتی تھی۔ صبح سے شام تک شوہر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی تھی کہ کہیں وہ شبہ یا احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن جب وہ گھر میں موجود نہ ہوتا یا نیند میں گم رہتا تو وہ انیکسی کی آغوش میں پہنچ جاتی تھی۔

ایک روز امداد میاں نے بہت مجبور ہو کر جھجکتے ہوئے کہا۔ "مومی! رات کو کوٹھی سے باہر نہ نکلا کرو۔"

مومی نے چونک کر اسے دیکھا۔ خیال ہوا کہ شاید چوری پکڑی گئی ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔ "رات نیند نہیں آتی تو میں باغیچے میں ٹہلنے چلی جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر بہاری غنڈے کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے مگر انور صاحب بہاری ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہمیں کوئی

نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"میرا دل نہیں مانتا' ڈرتا ہوں کہ کوئی تمہیں اٹھا کر نہ لے جائے۔ جب تک حالات معمول پر نہ آجائیں' تمہیں رات کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

وہ ذرا چپ رہی۔ بے چینی سے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "اگر آپ انور صاحب کو اس کوٹھی میں کوئی کمرہ رہنے کے لیے دیں تو.........؟"

امداد میاں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ رات کو اگر غنڈوں نے حملہ کیا تو انور صاحب کو انیکسی سے یہاں تک پہنچنے میں دیر لگے گی۔ ہم تینوں یہاں ایک جگہ رہ کر رات کے وقت کوٹھی کو اندر سے بند رکھ سکتے ہیں۔"

ازدواجی زندگی گزارنے والے میاں بیوی گنتی کے وقت ہم دونوں کہتے ہیں۔ موی "ہم تینوں" کہہ رہی تھی یہ بات امداد میاں کے دل میں چبھ گئی۔ شدید احساس ہوا کہ وہ بے شرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارا مذہب سکھاتا ہے کہ بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلقات نہ رکھ سکو تو اسے آزاد کردو۔ تاکہ وہ کسی کے ساتھ شرعی ازدواجی زندگی گزار سکے۔ ایسا نہیں کرو گے تو تمہارے درمیان گناہ کے راستے کھل جائیں گے اور تم ایک دوسرے کے ساتھ بے حیائی سے رشتے قائم کرتے رہو گے۔

امداد میاں نے جھکی ہوئی نظروں سے موی کو دیکھا۔ وہ موی کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ مذہبی احکامات اپنی جگہ اٹل سہی مگر آدمی دل کے ہاتھوں بھی تو مجبور ہوتا ہے۔ یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ جو بھی اچھی چیز اپنے ہاتھ سے نکلنے لگتی ہے' اسے وہ اور شدت سے پکڑ کر رکھنا چاہتا ہے۔ ایک طرح سے وہ موی کا عادی ہو گیا تھا۔ جب تک اس کے سینے سے سر لگا کر آنکھیں نہیں بند کرتا' تب تک نیند نہیں آتی تھی۔ اگر وہ دور ہوتا تو ہوا کا کوئی جھونکا آتا اور موی کے بدن کا پسینہ نتھنوں میں آکر مہکنے لگتا۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو جاتا۔ موی کو ایسے ڈھونڈتا جیسے مسافر کارواں کو اور بچہ ماں کو ڈھونڈتا ہے۔ آدمی بڑھاپے میں بچہ بن جاتا ہے۔ وہ بھی ایک بچے کی طرح موی کے لیے ضد کرتا تھا۔

وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ایسے حالات میں تم باہر باغیچے میں بھی جاؤ۔ اب کوٹھی کے اندر رہنے کے لیے تم جو چاہو' سو کرو' میں اعتراض



ں کروں گا۔"

موی خوش ہو گئی۔ اس نے انیکسی میں آکر انور سے شوخی میں کہا۔ "میں تمہیں ب خوش خبری سناؤں گی۔ تم مجھے کیا انعام دو گے؟"

انور تصویر بنا رہا تھا۔ اس نے برش کو ایک طرف رکھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہا۔ "بتاؤ' کیا خوش خبری ہے؟"

وہ جلدی سے بولی......... "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے' اگر وہ چانک یہاں آجائیں تو؟"

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "کون آجائیں تو؟ بہاری یا بنگالی؟"

وہ ہونٹوں کو بھینچ کر اس کے سینے پر ہلکے سے گھونسا مار کر بولی۔ "میں میاں صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ جانتے ہو آج میں نے انہیں اس بات پر راضی کرلیا ہے کہ تم رات کو انیکسی میں نہیں' کوٹھی میں رہا کرو گے۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ یہاں رات کو غنڈے بدمعاشوں کا خطرہ ہے۔"

"خطرہ مجھے نہیں' تمہیں ہے۔ کیونکہ تم کوٹھی سے رات کو نکل کر پچیس قدم کا فاصلہ طے کر کے یہاں آتی ہو۔ یقیناً میاں صاحب نے رات کو تمہیں یہاں آتے دیکھا ہو گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ اگر وہ کبھی دیکھ لیں گے تو ہم دونوں کو جان سے مار ڈالیں گے........."

ایسا کہتے وقت موی کے لہجے میں پختگی نہیں تھی۔ حالات بتا رہے تھے کہ امداد میاں سب کچھ جانتا ہے اور انجان بنتا ہے لیکن موی اسے تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسا سوچنے سے امداد میاں کے کردار پر حرف آتا اور وہ بچپن سے ان کی پوجا کرتی آئی تھی۔ اس لیے حالات کچھ بھی کہیں' وہ اپنے میاں صاحب کو بے غیرت تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔

انور نے مسکرا کر کہا۔ "میں میاں صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ کوئی بھی بوڑھا خاوند کسی نوجوان کو اپنی حسین بیوی کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا' کجا یہ

کہ انہوں نے مجھے یہاں بلا کر رکھ لیا ہے۔ جب پہلی بار تم نے مجھے یہاں آکر رہنے کے لیے کہا تو میں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہاں رہنے سے ہماری ملاقاتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ تم نے مجھے یقین دلایا کہ میاں صاحب شکی نہیں ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں' واقعی وہ بڑے فراخدل ہیں۔ اب کوٹھی کے اندر رہنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ہم دونوں جوان ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں اور ہر رات ہمارے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ رہے گا اور جوانی ایسے فاصلوں کو ایک ہی جست میں طے کر لیتی ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مومی! مجھے یقین ہے کہ میاں صاحب ہمارے تعلقات کو سمجھ رہے ہیں۔"

وہ غصے سے بھڑک گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "تمہیں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ کیا تم میرے شوہر کو بے غیرت سمجھ رہے ہو؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارے جیسا فنکار میری مجبوریوں کو سمجھنے کے بعد' مجھ سے تعلقات قائم کرنے کے بعد میرے عزت دار اور غیرت مند شوہر پر اس طرح کیچڑ اچھالے گا۔"

انور نے ندامت سے کہا۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہارے میاں صاحب کی توہین نہیں کر رہا ہوں۔ کچھ جہاندیدہ لوگ ایسے ہوتے ہیں' جو اخلاق اور تہذیب کی لاج رکھنے کے لیے کچھ ناپسندیدہ باتوں کو پسند کر لیتے ہیں۔ جو شخص ایسا مصلحت پسند ہو کہ ہمارے تعلقات پر کیچڑ نہ اچھالے' میں اس پر کیسے کیچڑ اچھال سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ اب بھی تم یہی کہہ رہے ہو کہ وہ ہمارے تعلقات کو سمجھ رہے ہیں اور مصلحتاً برداشت کر رہے ہیں؟"

"تم بُرا مانتی ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"گالی دے کر الفاظ واپس لینے سے کیا گالی نہیں پڑتی؟ کیا گالی سے ملنے والی ذلت کا احساس ختم ہو جاتا ہے؟"

وہ غصے سے جانے لگی۔ انور نے آواز دی۔ "رک جاؤ مومی! میری بات تو سنو۔"

وہ دروازے سے پلٹ کر بولی۔ "میں تم سے پہلے ہی دن کہہ چکی تھی کہ میں کسی



صورت میں میاں صاحب کی توہین برداشت نہیں کروں گی۔ خدا کے بعد میرا کوئی ہے تو وہ میاں صاحب ہیں۔ تم نے جو کچھ کہا' انہیں نہیں کہا بلکہ میرے منہ پر جوتا مارا ہے۔"

"مومی! میں شرمندہ ہوں.........."

مومی کچھ سنے بغیر غصے سے تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ وہ اسے پکارتا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ کیونکہ اس کے پکارنے کی آواز امداد میاں کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر سوچنے لگا۔ مومی اور امداد میاں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

امداد میاں نے پہلی ملاقات میں اس سے کہا تھا۔ "مومی کو مصوری سے دلچسپی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہوٹل میں رہنے کے بجائے ہماری انیکسی میں رہو۔ یہاں تصویریں بناؤ۔ مومی کا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا۔"

انور تقریباً ایک ہفتے سے انیکسی میں رہ رہا تھا۔ مومی آدھی رات کو آتی تھی اور جلدی چلی جاتی تھی۔ انور کے دماغ میں یہ سوال کلبلاتا تھا' کیا کسی رات امداد میاں کی آنکھ نہیں کھلتی ہو گی؟

مومی نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ میاں صاحب خواب آور گولی کھا کر سوتے ہیں۔ تب انور نے ضد کی کہ مومی کو رات کے وقت اس کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا چاہیے مگر وہ جلدی بھاگ جاتی تھی۔ کیوں چلی جاتی تھی۔ جبکہ امداد میاں دوا کے اثر سے گہری نیند سوتے ہوں گے؟ یہ باتیں ایسی تھیں جو انور کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھیں کہ امداد میاں جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں اور یہی بات مومی کو بُری لگ گئی تھی۔

وہ انور کو غصہ دکھا کر کچن میں آئی اور رات کا کھانا تیار کرنے لگی پکانے کے دوران اس کے دماغ میں انور کی باتیں گونجتی رہیں۔ وہ نادان نہیں تھی۔ امداد میاں کی مصلحت اندیشی کو سمجھ رہی تھی۔ مگر شرم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جب تک بے شرمی چھپی رہے ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی شرم کو برقرار رکھنا چاہیے اور وہ اپنی شرم رکھ رہے تھے۔ ایسے میں انور نے ان کی ذات پر حملہ کیا تھا۔ مومی کے نقطۂ نظر سے امداد میاں اس کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہے تھے۔ اس لیے وہ ان کے خلاف کوئی بات سننا پسند

نہیں کرتی تھی۔ اور اسی لیے وہ انور کو غصہ دکھا رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ جب تک وہ اس کی خوشامد نہیں کرے گا اور امداد میاں کی غیرت مندی کا اعتراف نہیں کرے گا' آئندہ ان کی برائی کرنے سے توبہ نہیں کرے گا' وہ اس سے بات نہیں کرے گی۔

رات کو کھانے کا وقت ہوا تو اس نے انیکسی سے باہر کھڑے ہو کر انور کو آواز دی۔ یہ کہہ کر واپس جانے لگی کہ میاں صاحب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔ انور نے انیکسی کے اندر آنے کے لیے اس سے التجا کی مگر وہ کوٹھی میں چلی گئی۔ کچن سے کھانا لا کر میز پر رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد انور وہاں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مومی' امداد میاں کے پاس بیٹھ کر کھانے لگی۔ امداد میاں نے کھانے کے دوران انور سے کہا۔ "شہر میں بڑی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تمہیں رات کو انیکسی میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ یہ اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ یہاں کسی کمرے کو اپنا بیڈ روم بنالو۔"

انور کو یہ معلوم تھا کہ مومی بھی یہی چاہتی ہے۔ اس نے اسے ستانے کے لیے کہا۔ "میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں کھڑکیوں اور دروازوں کو اندر سے بند کر کے سوتا ہوں۔"

"پھر بھی ہمیں اطمینان نہیں ہوتا۔" امداد میاں نے کہا۔ "خدانخواستہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو ہمیں بہت افسوس ہوگا۔ تم ہمارے ہاں ہو۔ ہم پر تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہے۔"

وہ بولا۔ "میں آپ کی محبت اور مہربانیوں کو مانتا ہوں۔ آپ کے حکم سے انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن.........."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مومی لقمہ چباتے چباتے رک گئی۔ امداد میاں نے پوچھا۔

"لیکن کیا؟"

"میں نے ایک تصویر شروع کی ہے۔ آج پتا نہیں کتنی رات تک پینٹنگ کرتا رہوں گا۔ کل بھی وہ شاید مکمل نہ ہو۔"

"پینٹنگ کا سامان کوٹھی میں لے آؤ۔"

"میں نے انیکسی کے ماحول میں ایک خاص موڈ میں کام شروع کیا ہے۔ ماحول بدلے



گا تو موڈ بھی بدل جائے گا۔ میں آپ کو اپنی مجبوری سمجھا نہیں سکتا۔"

امداد میاں نے کہا۔ "ایک آرٹسٹ ہی اپنے موڈ کو سمجھ سکتا ہے.......... ٹھیک ہے جس دن تصویر مکمل ہو' کوٹھی میں چلے آنا۔"

انور نے فاتحانہ انداز میں مومی کو دیکھا۔ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"بس میں اور نہیں کھاؤں گی۔"

امداد میاں نے اسے بٹھا کر کھلانے کی ضد کی مگر وہ بہانہ کر کے کچن میں چلی گئی۔ انور بھی کھانے سے فارغ ہونے کے بعد امداد میاں سے اجازت لے کر انیکسی کی طرف چلا گیا۔ مومی دوبارہ کچن سے واپس آئی تو امداد میاں نے پوچھا۔ "کیا انور سے ناراضگی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"آج تم اس کی موجودگی میں ایک بار بھی نہیں مسکرائیں۔"

"مجھے سر بھاری لگ رہا ہے۔ ایسے میں مسکرانے کا خیال نہیں رہتا۔"

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ انور کوٹھی میں آ کر رہنا نہیں چاہتا۔ اس نے ماحول اور موڈ کا بہانہ کیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہماری بلا سے یہاں آ کر نہ رہے۔ آپ نے سمجھانے کا فرض ادا کر دیا۔ اب اس کی خوشامد تو نہیں کی جاسکتی۔"

امداد میاں وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں جانے لگے۔ مومی کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ انور سے ناراض ہے' غصہ میں ہے۔ شاید انور سے بیزار ہوگئی ہے یا انور کا دل اس سے بھر گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ بات خوش آئندہ تھی۔ امداد میاں کو خوشی ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد مومی ناریل کا حقہ تیار کر کے لے آئی۔ وہ چور نظروں سے مومی کے تیور کو بھانپ رہا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سوچا۔ "میں بھی تو اکثر مومی سے روٹھ جاتا ہوں تاکہ وہ منائے اور اس کی محبت کا یقین ہو کہ وہ مجھے ناراض نہیں دیکھ سکتی۔ ناراضگی اسی سے ہوتی ہے' دکھاوے کی نفرت اسی سے ہوتی ہے۔ جس

سے کڑی محبت ہوا کرتی ہے۔ کیا موی کے دل میں آرٹسٹ کی محبت نقش ہو گئی ہے؟ کیا وہ چاہتی ہے کہ آرٹسٹ اسے پیار سے منائے اور گلے سے لگا کر گلے دور کر دے؟"

اسی سوچ کے دوران اس کے اندر بے چینی پیدا ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ آرٹسٹ ایک وقتی ضرورت رہے۔ موی کی محبت نہ بنے لیکن محبت اور ضرورت کے درمیان جنگ ہو تو اکثر ضرورت غالب آجاتی ہے۔ مثلاً اناج ایک ایسی ضرورت ہے' جس کی خاطر آدمی محبت کے رشتوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ مثلاً آدم کو شجرِ ممنوعہ کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت تمام عمر کی عبادت اور خدا کی محبت پر غالب آئی تھی۔ اس کی سزا آدم کو ملی۔ سزائیں تو آج بھی ملتی ہیں مگر آج بھی ضرورت ہی غالب آتی رہتی ہے۔

اس نے حقے کا کش لیا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز اُبھری۔ وہ اپنے دل میں بڑبڑانے لگا۔

"کچھ بھی ہو۔ محبت کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ محبت ایک روحانی جذبہ ہے۔ موی مجھے روح کی گہرائی سے چاہتی ہے' اور اسے ضرورت کے لیے پوچھتی ہے۔ ضرورت تو بس آنی جانی ہوتی ہے۔"

ہاں انسان بھی دنیا میں آتا ہے چلا جاتا ہے۔ ضرورت بھی اس کے ساتھ آتی ہے اور اس کے ساتھ ہی جاتی ہے۔ انسان اس کے لیے لڑتا ہے پسینہ پسینہ ہوتا ہے۔ خون بہاتا ہے۔ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ بے شک محبت روحانی ہوتی ہے۔ مگر ضرورت زندگی کی جان ہے۔ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ زندگی بے ضرورت ہو ہی نہیں سکتی۔ محبت بھی وہاں ہوتی' جہاں چھپی ہوئی ضرورت چپ چاپ چنگاری سے شعلہ بنتی آتی ہے۔

☆======☆======☆

رات کو حسبِ معمول موی اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر اسے تھپک تھپک کر سلانے لگی' اس نے کہا۔ "موی! شہر میں اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ تم باغیچے میں ٹہلنے جاؤ گی تو مجھے فکر سے نیند نہیں آئے گی۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر کمرے میں تمہیں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔"



"میں کھڑکیاں کھول دوں گی مگر باہر نہیں جاؤں گی۔ آپ اطمینان سے سو جائیں۔"

امداد میاں نے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر نہ جانے کی بات پر موی کا دل ضد کرنے لگا تھا۔ دھڑک دھڑک کر سینے کی دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا۔ انور کو پکار رہا تھا اور اس کے سینے سے امداد میاں کا سر لگا ہوا تھا اور ان دھڑکنوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ دھڑکنیں محبت کے لیے ہیں یا ضرورت کے لیے۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں لیٹی رہی۔ جب امداد میاں کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو وہاں سے اٹھ گئی۔ اپنے بستر پر جانے کا ارادہ تھا مگر بے ارادہ کھڑکی کے پاس آ کر اس کے پٹ کھول دیئے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے بالکل سامنے انیکسی نظر آنے لگی۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے۔ انیکسی کا اسٹوڈیو والا کمرہ روشن تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور تصویر بنا رہا ہے۔ خیال کے سادے کینوس پر موی کی تصویر۔

وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے قراری کو سہلانے لگی۔ پھر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ کمرے کے وسط میں آ کر وہ پلنگ کے درمیان ٹہلنے لگی۔ کہیں سکون نہیں مل رہا تھا۔ دل انیکسی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ انور کو پانے سے پہلے وہ سوچتی تھی کہ وہ صرف امداد میاں کو چاہے گی۔ وہ جو ایک شہزادے کا تصور ہے تو وہ اب ضرور تا آئے گا۔ امداد میاں کی محبت کی جڑیں دل کی گہرائیوں تک ہیں۔ کوئی انہیں اکھاڑ نہیں سکتا۔ انور بھی امداد میاں کو نہیں اکھاڑ رہا تھا مگر اس سے الگ موی کے دل پر سکہ جما رہا تھا۔

ضرورت تو کہیں بھی پوری ہو سکتی ہے۔ ایک انور ہی کیوں؟

یہاں عورت کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہ کپڑے بدلتی ہے۔ مرد نہیں بدلتی۔ امداد میاں اگر پھٹا پرانا لباس بھی بن سکتا تو وہ انور کو ہرگز نہ پہنتی۔ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق گناہ کی ایک حد مقرر کرتا ہے موی انور کی حد سے آگے کسی اور کے متعلق سوچنا گناہ سمجھتی تھی۔

رات کا ایک بج گیا۔ دو بج گئے کھڑکی کے باہر انیکسی کا کمرہ روشن رہا۔ وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کھڑکی کی طرف سے منہ پھیر کر امداد میاں کی طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوششیں کرنے لگی۔ ادھر چند دنوں سے بڑی آسودگی ملی تھی۔ جذبات نہیں بھڑک رہے

تھے۔ اسے ہوس نہیں کھینچ رہی تھی۔ انور کی شخصیت اسے پکار رہی تھی پہلے ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلے ضرورت کھینچ کر لاتی ہے پھر رفتہ رفتہ محبت کا روگ لگتا ہے۔ ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اسے انور سے کیسی محبت ہے؟ کیا اس کے بازوؤں میں سب کچھ ہارنے کے بعد وہ اچھا لگ رہا ہے یا اس کے جیتنے کا انداز لبھا رہا ہے؟ یا پھر یہ حقیقت ہے کہ آدمی سماجی جانور ہے۔ قریب آکر ایک دوسرے کو پہچانتا ہے۔ یہی پہچان محبت بڑھاتی ہے۔

وہ کروٹیں بدل بدل کر سوگئی۔ صبح چار بجے تک امداد میاں بھی ایک آنکھ سے جاگتا رہا تھا۔ خواب گاہ میں زیرو پاور بلب کا یہی فائدہ تھا۔ صفر درجہ کی روشنی میں سونے یا جاگنے والا پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ چار بجے جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ سوگئی ہے تو وہ بھی مطمئن ہو کر سوگیا۔

دو گھنٹے بعد ہی موی کی آنکھ کھل گئی چھ بج گئے تھے۔ دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دماغ میں انور کا ہی خیال تھا۔ سوتے وقت بھی خیالوں میں وہی تھا۔ امداد میاں تو سامنے تھے' جو سامنے ہوتا ہے' اسے یاد نہیں کیا جاتا۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ انیکسی کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ پتا نہیں وہ رات کو سویا بھی تھا یا نہیں؟

وہ پلٹ کر کمرے سے باہر آئی۔ پھر کوٹھی سے باہر نکلی پچیس قدم کا فاصلہ طے کر کے انیکسی کے دروازے پر پہنچی۔ انور اپنے پلنگ کے پاس کھڑا ہوا ایک سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ ایک طرف پینٹنگ کا سارا سامان بندھا پڑا تھا۔ موی نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ سامان کیوں باندھ لیا ہے؟"

وہ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں جارہا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہو؟ کیوں جارہے ہو؟"

اس نے سوٹ کیس کے پاس سے گھوم کر اسے دیکھا پھر جواب دیا۔

"اس لیے جارہا ہوں کہ آدمی کو اپنی جگہ اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہیے ہم ہندوستان سے اپنی زمین چھوڑ کر آئے مگر یہاں کی سرزمین پر اپنے قدم نہ جماسکے' لگتا ہے



بہت جلد ہمارے قدم اکھڑنے والے ہیں۔ میں برسوں سے ہوٹل میں رہتا آیا ہوں۔ تمہارے بہکانے پر وہ جگہ چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب یہاں تمہارے تیور بدلتے جارہے ہیں۔ کل ایک ذرا سی بات پر تم ایسی ناراض ہوئیں کہ..........."

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "کیا مجھے ناراض ہونے کا حق......... نہیں ہے؟ میں اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کر چکی ہوں۔ کیا مجھے اتنی سے توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ میں روٹھ جاؤں گی تو تم مجھے مناؤ گے؟"

"تم میرے گھر میں میرے ہوٹل کے کمرے میں روٹھ جاتیں تو میں ہزار بار مناتا۔ یہاں مجھے احساس ہوا کہ تم اپنے گھر بلا کر اپنے پیچھے لگا رہی ہو۔ عورت کے گھر میں رہ کر اس کی خوشامدیں کرنے والا گھر داماد ہوتا ہے' یا زن مرید۔ آج یہ عقل آگئی ہے کہ عورت کے لیے اپنا گھر اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

موی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "ایسے ہی تجربات کی باتیں کر رہے ہو تو بتاؤ کیا ایک عورت کو دوسرے مرد کے لیے اپنے مرد کو دھوکا دینا چاہیے؟"

"یہ عورت کو سوچنا چاہیے۔"

"جب تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تو صرف عورت کو کیوں سوچنا چاہیے۔ تم بالکل ہی معصوم نہیں ہو۔ جب میں تمہارے پاس آتی تھی اس وقت تم اشارتا بھی کہہ سکتے تھے کہ اے عورت تُو غلطی کرنے آئی ہے۔ تُو اپنے مرد کو دھوکا دینے والی بے وفا اور بدکار عورت ہے۔ مگر کوئی مرد پہلے ایسا نہیں کہتا۔ پہلے بدکاری میں شریک ہوجاتا ہے۔ بعد میں طعنے دیتا ہے۔"

"میں طعنے نہیں دے رہا ہوں۔ میں نے تمہیں گناہ کے خیال سے نہیں' محبت کے جذبے سے اپنایا تھا۔ مگر تم دو مردوں کی محبت میں تقسیم ہوگئی ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔"

"ایسی مجبوریوں کو کوئی نہیں مانتا۔ تم بہن' بیٹی' اور ماں بن کر ہزاروں سے محبت کر سکتی ہو لیکن محض ایک عورت بن کر' محض ایک مرد سے وفا کرنا ہوگی۔ دو مردوں سے بیک وقت وفا نہیں ہوسکتی۔"

"تم صرف دو سے وفا کی بات کرتے ہو۔ جبکہ مرد بیک وقت چار عورتوں سے وفا کرنے اور برابر انصاف کرنے کا دعویٰ کرتا آیا ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر مومی کو دیکھا۔ "میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ میں تمہیں صرف اپنی ملکیت بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحہ میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ میں نے سامان باندھ لیا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "انور! یہ کیسا ستم ہے پہلی ملاقات میں تم نے میری مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا۔ میرے بوڑھے شوہر کے وجود کو برداشت کرلیا تھا۔ میری شوہر پرستی کی بھی تعریف کی تھی کہ میں انہیں بڑھاپے میں تنہا اور بے یارومددگار چھوڑنا نہیں چاہتی۔ آج تم میاں صاحب کو چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ پھر ایک دن آئے گا جب تم طعنہ دوگے کہ ایک مرد کو ٹھکرانے والی دوسرے مرد سے بھی وفا نہیں کرسکتی۔"

"میں طعنے نہیں دوں گا۔"

"انور! ہمارے سماج کی کوئی کل سیدھی ہو تو یقین بھی کیا جائے کہ طعنے نہیں ملیں گے۔ کل تمہیں میری ایک بات اچھی لگی آج وہی بات غلط ہے اور آج جس بات کو تم اچھا کہہ رہے کل وہ بات بھی غلط ہوجائے گی۔"

"ہاں' ہماری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم ایک ٹھوس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی نہیں گزارتے ہم نے بھی جذبات میں بہہ کر بے حیائی کی ہے۔ ہم بچے نہیں ہیں۔ ہم اب بھی ایسی غلطی سے باز آکر مذہبی' قانونی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا راستہ دکھا رہا ہوں۔ اس راستے پر میرے ساتھ چل سکتی ہو تو چلی آؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔ مومی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔ "مذہب' قانون اور اخلاق سب اپنی جگہ اٹل ہیں۔ میں صرف انسانیت کے ناطے سے پوچھتی ہوں۔ کیا ایک بوڑھے کی آس اور امید توڑ دوں؟ اس کے اعتماد پر تھوک دوں؟ اسے اس عمر میں یہ ذلت اٹھانے کے لیے چھوڑ دوں کہ میں اسے ٹھکرا کر چلی گئی ہوں وہ میری جوانی کی دھوپ میں سایہ نہیں بن سکتا۔ کیا میں بھی اسے اپنے آنچل



کے سائے سے بھگادوں؟ انسانی رشتے کچے دھاگے تو نہیں ہوتے کہ تم نے کہا اور ٹوٹ گئے۔"

انور نے جواب نہیں دیا۔ مومی کے روکنے والے ہاتھوں کو ایک طرف ہٹا کر جانے لگا۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل سے اور بھیگتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جانے والے کے قدم دروازے کے پاس رک گئے۔ جیسے وہ جانا نہ چاہتا ہو اور جارہا ہو۔ اس نے پلٹ کر مومی کو دیکھا۔ ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔ "واقعی انسانی رشتے توڑے نہیں جاسکتے اور نہ ہی میں تم سے رشتہ توڑ کر جارہا ہوں۔ ہم دور رہیں گے تو ایک دوسرے کی اہمیت کا صحیح پتا چلے گا۔ پھر ہم اپنی اپنی جگہ سوچیں گے اور فیصلہ کریں گے کہ ہم کس کو چھوڑ کر اور کس کو اپنا کر جائز ازدواجی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

اس نے دروازے کے پاس رکھے ہوئے ایزل کو اٹھا کر شانے سے لٹکایا ایک کینوس کو بغل میں دبایا۔ پھر پینٹنگ کے سامان سے بھرا ہوا تھیلا اٹھا کر وہاں سے جانے لگا۔ مومی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ جانے والے کے ہر قدم پر گمان ہوتا تھا کہ وہ لوٹ آئے گا لیکن وہ جاتے جاتے نظروں سے اوجھل ہوگیا تب اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا سینے کے اندر دل کے ٹوٹنے کا پتا چلا تھا۔ وہ پلٹ کر انور کے خالی چھوڑے ہوئے بستر پر آئی اور اس پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

رونے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی جانے والا آنسو پونچھنے نہیں آتا۔ روتے روتے اُسے خیال آیا کہ بہت دیر ہوچکی ہے' دھوپ تیز ہورہی ہے میاں صاحب بیدار ہوگئے ہوں گے وہ جلدی سے اٹھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ آئینے کے سامنے پہنچ کر ساڑھی کے پلو سے اپنے چہرے کو صاف کیا۔ کہیں کہیں بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں کی کنگھی سے جمایا۔ پھر انیکسی سے باہر آگئی۔ وہاں کا دروازہ بند کرتے وقت دل رو رہا تھا کہ اب وہ نہیں آئے گا۔

جب وہ کوٹھی کے اندر اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو امداد میاں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی' وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کیتلی اٹھا کر ایک پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

"چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ تم نہیں تھیں۔ اس لیے میں خود چائے بنا کر لے آیا۔ آؤ ایک پیالی پی لو۔"

موی کو اپنا سر بھاری لگ رہا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وہ چلے گئے۔"

اس نے پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ پیا۔ چائے بہت میٹھی تھی۔ جی متلانے لگا۔ سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ وہ درد میں کمی کرنے کی خاطر باسی منہ چائے پی رہی تھی۔ دوسرا گھونٹ پیتے ہی اُبکائی محسوس ہوئی۔ وہ فوراً ہی پیالی کو رکھ کر تیزی سے چلتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔ دوسرے ہی لمحے قے کرنے کی آواز سنائی دی۔

امداد میاں کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ وہ اضطراب کی حالت میں سیدھے ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اضطراب قائم رہا۔ کیونکہ باتھ روم سے ٹھہر ٹھہر کر کبھی اُبکائی آنے، کبھی قے کرنے اور کبھی کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ امداد میاں کے کانوں میں جیسے ہوائیں شور مچا کر آنے والے طوفان کی اطلاع دے رہی تھیں۔ وہ گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ مگر اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔

باتھ روم سے آنے والی آوازیں تھم گئیں۔ اب شاید موی وہاں سے آنے والی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگا مگر وہ نہیں آئی۔ امداد میاں کے پیچھے باتھ روم کا دروازہ تھا۔ شرم کے مارے وہ پلٹ کر پیچھے دروازے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ چپ چاپ موی کو ڈھیل دیتا رہے گا اور اس کے چور رشتے سے انجان بنا رہے گا۔ اس طرح اس کا بڑھاپا اور موی کی جوانی شرم کے پردے میں گزر جائے گی لیکن اب قدرت نے اس پردے کو چاک کر دیا تھا۔ اب اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ موی سے آنکھ ملا سکتا اس بوڑھے نے گناہ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک گناہ تھا کہ وہ جوان بیوی کا شوہر بنا بیٹھا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے سنگھار میز کا ایک قدِ آدم آئینہ تھا۔ اس آئینے میں موی سر جھکائے باتھ روم کے دروازے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ ایک ہتھیلی سے چھپا ہوا تھا۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ میاں صاحب کا سامنا



نہیں کر سکتی تھی۔ انور نے یہی تو کہا تھا کہ میاں صاحب جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں۔ موی نے اس حقیقت سے انکار کیا تھا۔ اب وہی حقیقت سامنے تھی۔ امداد میاں جان بوجھ کر انجان بنا بیٹھا تھا۔

موی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ ہلکی ہلکی آواز میں رونے لگی۔ آنسوؤں کی زبان میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگی۔ اپنی شرمساری کو آنسوؤں کے ذریعہ میاں صاحب تک پہنچانے لگی مگر وہ پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور میاں صاحب کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہ ہوا تو وہ مجبور ہو کر ہچکچاتے ہوئے بولی!۔ "آپ خاموش کیوں ہیں؟ مجھے گالی کیوں نہیں دیتے؟ مجھے مارتے کیوں نہیں؟ مجھ پر تھوک دیجئے۔ کچھ نہیں کر سکتے ہیں تو گھر سے نکل جانے کا حکم دیجئے میں پھر کبھی اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔"

امداد میاں کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اب بھی پلٹ کر موی کو نہیں دیکھا۔ نظریں چراتا ہوا آہستہ آہستہ چھڑی ٹیکتا ہوا خواب گاہ سے باہر جانے لگا۔ موی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب گاہ کے دروازے پر رک گیا۔ موی کی طرف دیکھے بغیر بولا..........

"جس عورت کا شوہر زندہ ہو' اسے بدنامی کی آنچ نہیں لگتی۔ آرام کرو۔"

وہ چلا گیا۔ موی باتھ روم کی چوکھٹ سے لگی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر یوں آہستہ آہستہ بیٹھنے لگی جیسے شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہو۔

☆======☆======☆

انور موی کو چھوڑ کر آ گیا تھا۔ مگر اب پچھتا رہا تھا۔ دل اُسی طرف کھنچا جا رہا تھا اور دماغ اسے روک رہا تھا۔ ایک فن کار کی سوچ میں جو نفاست ہوتی ہے۔ وہ اسے سمجھا رہی تھی کہ محبت کے نام پر گناہ نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک موی کو چھوڑا نہیں جا سکتا لیکن غیر اخلاقی طریقہ سے حاصل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے بُرے کی پہچان کے لیے دماغ دیا ہے۔ کچھ تو اس دماغ سے کام لے کر برائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اسے رہنے کے لیے ہوٹل کا وہی کمرہ خالی مل گیا تھا جہاں وہ پہلے رہتا آیا تھا۔ بلکہ اب تو سارا ہوٹل ہی خالی پڑا رہتا تھا۔ شہر کے راستے بھی ویران رہتے تھے۔ بنگالی بہاری

فسادات نے زور پکڑ لیا تھا۔ پہلے بنگالیوں کا پلڑا بھاری رہا تھا میمن سنگھ اور سنتاہار میں ایک بہاری کو زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اگر پاکستانی فوج آڑے نہ آتی تو دوسرے شہروں سے بھی بہاریوں کا صفایا ہوجاتا۔ بہرحال بہاریوں نے انتقاماً بنگالیوں کے خون کی ندیاں بہادیں۔ کچھ عرصہ تک ایسا ہوتا رہا۔ پھر اچانک بنگالیوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔ پاکستانی فوج کے جوان جب بھی امن و امان قائم کرنے کے لیے بیرکوں سے باہر آنا چاہتے۔ ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں۔ فوجی گاڑیوں کو روکنے کے لیے کہیں راستے میں درخت کاٹ کر گرا دیے جاتے تھے۔ کہیں لانچ کو تباہ کر دیا جاتا تھا اور کشتیاں غائب کر دی جاتی تھیں' ٹیلیفون وغیرہ کے تار کاٹ دیے جاتے تاکہ فوجی ایک جگہ سے دوسری جگہ رابطہ قائم نہ کر سکیں۔

ان حالات میں بہاری مغربی پاکستان بھاگ کر آنے لگے۔ ہر روز دو تین طیارے ان بہاری خاندانوں کو وہاں سے لاہور اور کراچی پہنچانے لگے۔ مومی نے ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ کیا انور بھی اسے چھوڑ کر چلا جائے گا؟

مومی نے دو دنوں سے انور کو نہیں دیکھا تھا اور دو دنوں سے امداد میاں' مومی کا منہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک کمرے میں ہوتی تو وہ سر جھکا کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ رات کو وہ اپنی خواب گاہ میں نہیں آتا۔ وہاں جانے سے دل کو یہ بات لگتی تھی کہ کسی دوسرے نے اس کی خواب گاہ پر شب خون مارا ہے۔ اگرچہ یہ بات وہ پہلے سے جانتا تھا تاہم جاننا اور بات ہے اور کسی بات کا بے شرمی سے کھل جانا اور بات ہے۔ ایسے میں کسی کا منہ دیکھنے یا اپنا منہ دکھانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔

مومی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ وہ دونوں بڑی احتیاط سے کام لیتے رہے تھے مگر کسی وقت جذبات کی اندھی غلطی ہوگئی تھی۔ کون عورت ماں بننا نہیں چاہتی؟ مومی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کہ بچے کو امداد میاں کا نام نہ ملتا اور امداد میاں کو ایک بچے کی خوشی نہ ملتی لیکن نہ چاہنے کے باوجود جب ایسا ہوگیا تو مومی کے اندر ممتا اٹڈنے لگی۔ ابھی تک امداد میاں اور انور کی دو طرفہ کشش تھی۔ اب وہ بچہ تیسری طرف سے کھینچ رہا تھا۔



ابتدا میں گناہ بہت آسان لگتا ہے۔ یقین ہوتا ہے کہ بے حیائی چھپی رہے گی اور ایسی ہوتی رہے گی۔ مومی کے خیال کے مطابق اسے امداد میاں سے محبت تھی اور انور کی ضرورت تھی۔ ضرورت ایسی بھی ہوتی ہے کہ وقت گزرا اور ضرورت ختم ہوئی۔ انور کو بھی مومی کی زندگی سے ختم ہوجانا چاہیے تھا لیکن جب اس کا جی متلانے لگتا' جب ابکائی آنے لگتی' جب وہ نڈھال ہوکر بستر پر گر پڑتی تو ایسے تمام وقت اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہتا اور اس اندھیرے میں انور ہی انور نظر آتا تھا۔ جو چیز جس سے منسوب ہوتی ہے' وہی یاد آتا ہے۔ امداد میاں تو یاد آنے سے رہے۔

مومی کے دو دن قیامت کی طرح گزرے۔ انور رہ رہ کر یاد آتا رہا اس کے بس میں ہوتا تو وہ پرواز کر کے اس پاس پہنچ جاتی۔ مگر امداد میاں کا رویہ عجیب تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بوڑھا کیا سوچ رہا ہے اور اب آنے والے لمحوں میں وہ کیا کرنے والا ہے۔ رات کو بڑی دیر تک خواب گاہ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ آدھی رات کو اٹھ کر اس نے کوٹھی کے اندر ایک چکر لگایا۔ معلوم ہوا کہ امداد میاں ایک کمرے میں ہیں اور دروازے کو اندر سے بند کر رکھا ہے۔ مومی نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے آواز دی۔ "آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ خدا کے لیے آپ غصہ دکھائیں۔ باہر آکر مجھے اتنا ماریں کہ میں مرجاؤں۔"

دروازے کے پیچھے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "مومی! کیا تم نے کبھی مجھے غصہ دکھایا ہے؟"

"میں بھلا کیسے دکھاتی؟ آپ نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔"

"پہنچایا ہے۔ پینسٹھ برس کی عمر میں چودہ برس کی چھوکری کو دلہن بنایا تھا۔ ایک دوشیزہ کی جوانی کو نقصان پہنچانا سب سے بڑا جرم ہے۔ مجھے اس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ میں اس سزا کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر رہا ہوں۔ اس لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"کیسے چھوڑوں۔ میں تنہا رہ جاؤں گی۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔ ابھی چلی جاؤ۔"

"چلی جاتی ہوں۔ مگر خدا کے لیے مجرم بن کر نہ سوچیں۔ آپ نے کوئی جرم نہیں

کیا۔ گناہ گار میں ہوں۔"

"موی! گناہ گار کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ گناہ کا بیج کہاں سے بویا گیا ہے؟ اس گناہ کی تحریک میرے بڑھاپے سے چلی ہے۔ پلیز چلی جاؤ۔"

وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ دوسرے دن دونوں کا سامنا ہوا دونوں بجھے بجھے سے تھے۔ ان کے اندر اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ باہر سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔ اس لیے ان کی نظریں جھکی رہیں۔ موی نے کھانا لاکر میز پر رکھا۔ وہ چپ چاپ کھا کر اٹھ گیا ڈرائنگ روم میں حقہ گرم تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر کش لگاتا رہا اور گہری سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ اس طرح وہ دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ موی کو وحشت سی ہونے لگی اِدھر امداد میاں اور اُدھر انور دونوں گیلی لکڑیوں کی طرح اس کے وجود میں سلگ رہے تھے اس کے اندر دھواں بھر رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔

دوسری رات بھی اس نے خواب گاہ میں تنہا گزاری صبح ہوتے ہی وہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں پہنچی اور دروازے کو پیٹ پیٹ کر جنونی انداز میں چیخنے لگی۔ "میں مر جاؤں گی۔ دروازہ کھولیے نہیں تو میں ابھی جان دے دوں گی۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ موی چیخنا بھول گئی۔ امداد میاں کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بھی موی کی طرح رات بھر جاگتا رہا ہے۔ موی کا دل محبت سے بھر گیا سر ندامت سے جھک گیا۔ وہ قدموں سے لپٹنے کے لیے جھکی لیکن امداد میاں نے فوراً ہی اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر قدموں کی طرف جانے سے روک دیا۔ موی نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تو اس بوڑھے نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

کہتے ہیں میاں بیوی کے درمیان جب تک ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوں' اس وقت تک ان کا رشتہ مضبوط اور پائیدار نہیں ہوتا لیکن موی اور امداد میاں کے درمیان ایسے تعلقات نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ امداد میاں نے کہا۔ "موی! ہم یہاں نہیں رہیں گے مغربی پاکستان چلے جائیں گے۔"



وہ بولی۔ "نہیں ہم اپنی زمین چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

"تم نہیں سمجھتیں یہاں میں تمہارے بچے کو اپنا نام نہیں دے سکوں گا۔ جوانی میں دو بیویاں مر چکی ہیں۔ ان سے اولاد نہیں ہوئی ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میں بانجھ ہوں۔ یہ بات میرے دوست احباب اور خاندان کے تمام افراد جانتے ہیں یہاں میری بدنامی ہو گی۔"

"یہاں سے جانے کے بعد کیا یہ بات چھپ جائے گی؟"

"ہاں تم دیکھ لینا۔ پاکستان کے دونوں بازو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ یہ بنگلہ دیش بن کر رہے گا۔ اِدھر کے لوگ اُدھر نہیں آسکیں گے اور اِدھر کے بنگالیوں کو کیا پڑی ہے کہ ادھر جائیں۔"

موی سوچنے لگی۔ امداد میاں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "وہاں لاہور یا کراچی میں انور بھی ہمارے ساتھ رہے گا۔"

موی نے چونک کر سر اٹھایا پھر نظریں ملتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔ اسی وقت انور جیسے آسمان سے ٹپک پڑا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر سے امداد میاں کو پکار رہا تھا امداد میاں نے موی کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اسے اندر بلا کر لے آؤ۔ آج ہم تینوں اپنے مستقبل کے بارے میں اہم فیصلے کریں گے۔"

موی چاہتی تھی کہ نہ جائے وہ آیا ہے تو اب اور قریب آکر اسے منائے وہ روٹھی رہے گی اس سے خوشامدیں کرائے گی لیکن اس کا موقع نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امداد میاں اسے بلانے کے لیے خود باہر جائیں۔ آخر وہ بزرگ ہیں۔ ان کی کوئی عزت ہے انہیں انور کے مقابلہ میں کم تر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر جانے لگی۔

انور برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ موی کو دیکھتے ہی ایک جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنسوؤں کی دھلی ہوئی سیاہ غزالی آنکھیں بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ موی نے نظریں جھکا کے روٹھے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ میرا.......... میرا ایک برش رہ گیا ہے وہ لینے آیا

ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے انیکسی کی صفائی کی تھی۔ وہاں ایک تنکا بھی نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ میری بربادی کا تماشہ دیکھنے آئے ہو۔"

"دیکھنے نہیں خود دکھانے آیا ہوں۔"

تب مومی نے دل کی آنکھ سے دیکھا۔ انور کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ لباس پر جابجا شکنیں تھیں۔ چہرہ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "نہ کھانے کو جی چاہتا ہے نہ سونے کو۔ میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں کہ تمہارے لیے یونہی جاگتے جاگتے مرجاؤں گا۔"

مومی نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کیے منہ پھیر کر بولی۔ "میاں صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں اندر آجاؤ۔"

"میں تمہارے میاں صاحب سے کیوں ملوں؟ میرا تعلق صرف تم سے ہے۔"

"میرے تعلق سے ملو۔ مگر اس سے پہلے ایک خبر سن لو پتا نہیں یہ خوشخبری ہے یا بے حیائی؟ میرے لیے یہ ایسی خوشی ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے میں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہوں۔"

انور نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تو عجیب خوشی ہے مجھے سناؤ۔"

مومی نے آنچل سے اپنے چہرے کو چھپالیا پھر اٹک اٹک کر بولی۔ "مم میں۔ میں ماں بننے والی ہوں۔"

انور نے چونک کر اسے دیکھا جلدی سے اس کے قریب آیا پھر خوش ہو کر پوچھا۔ "یہ ......... یہ میرا ہے؟"

اس نے آنچل میں چھپے ہوئے چہرے کو اثبات میں ہلایا۔ انور نے اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام کر پوچھا۔ "اس میں شرمانے اور ڈرنے کی کیا بات ہے ہم نے محبت کی ہے۔ میاں صاحب سے فوراً طلاق لو اور میرے نکاح میں آؤ۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گا کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں۔"

وہ انکار میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا نہیں ہو سکتا؟"



"میں پہلے کہہ چکی ہوں میں میاں صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ٹھیک ہے تم نے کہا تھا۔ مگر اب بچے کی خاطر فیصلہ بدلنا ہوگا وہ صرف میرا اور تمہارا ہے۔ ہم ایک معصوم بچے کی ولدیت کو غلیظ نہیں کریں گے۔"

"ہاں' یہ تم پر ہے تم چاہو تو بچے کی معصومیت پر حرف نہیں آئے گا۔ تم سنجیدگی سے اصول کے مطابق سوچو' میاں صاحب کی شریکِ حیات ہوں۔ اصولاً بچے کو میاں صاحب کا نام ملے گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا تم میری چیز کو دوسرے کو نہیں دے سکتیں۔"

"میں بھی تو دوسرے کی تھی۔ تمہاری کیسے ہوگئی؟ جذباتی نہ بنو میں تن من سے تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی ایک بوڑھے شخص کی مجبوری اس کی شرافت اور عزت کو سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو میں مرجاؤں گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میاں صاحب کو نہیں چھوڑو گی۔ مجھ سے شادی نہیں کرو گی ہم اسی طرح بے حیائی کی زندگی گزاریں گے؟"

"کوئی بھی سمجھ دار عورت بے حیائی پسند نہیں کرتی مگر میں جس دوراہے پر کھڑی ہوں۔ وہاں صرف یہی دعامانگ سکتی ہوں کہ خدا مجھے معاف کرے اور کوئی ایسا راستہ دکھائے کہ تم سدا میرے ساتھ رہو اور میاں صاحب کی آخری عمر میں' میں اپنے حصے کے فرائض نباہ سکوں۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"تم صرف اتنا سوچو' کہ مجھے موجودہ حالات میں اپنائے رکھنا چاہتے ہو یا نہیں اگر چاہتے ہو تو اندر آجاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس اعتماد کے ساتھ گئی کہ وہ بھی کچے دھاگے سے بندھا آئے گا اور اس کے جانے کا انداز نہایت ہی مناسب اور سبق آموز تھا۔ انور کو یہ سبق ملا کہ وہ منہ پھیر کر جائے گی تو وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسی طرح مومی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سرجھکائے اندر آگیا امداد میاں ڈرائنگ روم کے

ایک صوفہ پر بیٹھے ہوئے اپنے حقے کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں ناکام ہوتے دیکھ کر مومی نے ناریل کے حقے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر راکھ میں دبی ہوئی کسی نامعلوم چنگاری کو پھونکنے لگی۔ انور امداد میاں کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

تھوڑی تک ایک شرمسار سکوت چھایا رہا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کی جائے ان تینوں میں امداد میاں لٹا تھا۔ زیادہ قابلِ رحم تھا کیونکہ اس کی بیوی تھوڑی سی پرائی ہو گئی تھی ان کے نقطۂ نظر سے انور لٹیرا تھا۔ ایسا لٹیرا جس نے پہلے تو مومی کو لوٹا پھر ایک بچے کو چوری کے مال کی طرح اس کے گھر لے آیا۔ اس بوڑھے کو مجبور کیا کہ وہ اپنی غیرت کو مار ڈالے اور اپنی عزت کو بالائے طاق رکھ کر بے شرم بن کر کوئی نیا فیصلہ کرنے ان کے سامنے بیٹھ جائے۔ اس لوٹ کھسوٹ میں مومی کی طرف سے شہ ملتی رہی تھی کیونکہ جوانی شہ دینے کے لیے ہی ہوتی ہے۔

آخر امداد میاں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔"

مومی اور انور نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ امداد میاں نے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ملک کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔"

انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملکی حالات سے کیا لینا ہے۔ امداد میاں نے سمجھایا۔
"یہ پاکستان نہیں رہے گا اور میں پاکستان میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ باہر جانے کے تمام راستے بند ہو جائیں۔ ہمیں یہاں سے لاہور یا کراچی چلے جانا چاہیے اور انور ہم تمہارے ساتھ جائیں گے اور وہاں تم ہمارے ساتھ رہو گے ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔"

سچ بات تو یہ ہے کہ انور بھی پچھلے دو دنوں سے یہی سوچ رہا تھا رہ رہ کر مومی کا چہرہ سامنے آتا تھا اور وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچتا تھا کہ کسی طرح مومی کو یہاں سے بھگا کر مغربی پاکستان لے جائے۔ اب امداد میاں خود ہی یہ چاہتے تھے کہ مومی اور انور پاکستان کے دوسرے بازو میں جائیں۔ فرق یہ تھا کہ وہ بھی ساتھ رہتا کباب میں ہڈی نہیں ہوتی مگر ہو جاتی ہے۔



امداد میاں نے کہا۔ "ہزاروں بہاری مغربی پاکستان جانے کے لئے ائرپورٹ پر دن رات بیٹھے رہتے ہیں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ائرپورٹ پر ہی کھاتے اور سوتے اور طیارے میں جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں مگر برا نہ مانو یہ بہاری موت کے منہ میں بھی کاروبار کرتے ہیں یہاں ان کے بال بچوں کے لیے جان و مال کا خطرہ ہے اس کے باوجود کتنے ہی بہاری ایسے بھی ہیں جنہیں طیارے میں جانے کے لیے دو چار دن پہلے تاریخ اور سیٹ نمبر مل جاتی ہے مگر وہ لوگ اپنے سیٹ نمبر بلیک میں فروخت کر دیتے ہیں۔ تم چاہو تو کل کے طیارے میں دو سیٹ نمبر بلیک میں خرید سکتے ہو میں ابھی تمہیں پانچ ہزار روپے دیتا ہوں؟"

"صرف دو ٹکٹ؟" انور نے پوچھا۔

"ہاں تمہارے اور مومی کے لیے۔"

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

امداد میاں نے کہا۔ "میں کب چاہتا ہوں کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو؟ نہیں۔ میں ایک ہفتہ کے بعد کا سیٹ نمبر خرید لوں گا کیونکہ مجھے یہاں کی جائداد فروخت کرنے اور نقد روپے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔"

مومی نے کہا۔ "تو پھر آپ جائداد فروخت کرنا شروع کریں ہم سب ایک ہفتہ بعد جائیں گے۔"

امداد میاں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بچکانہ ضد نہ کرو۔ یہاں آنے والی گھڑیوں میں کیا قیامت آنے والی ہے کوئی نہیں جانتا۔ میں پہلی فلائٹ سے تمہیں صحیح سلامت بھیجنا چاہتا ہوں۔ تم بے جا ضد کرو گی تو ہم ادھر پاکستان میں اپنا اچھا مستقبل نہیں بنا سکیں گے یہاں ہم شاید بچ جائیں مگر انور بہاری ہے مکتی باہنی کے لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

مومی نے گھبرا کر انور کو دیکھا۔ امداد میاں یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا کہ وہ پانچ ہزار روپے لانے جا رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے پھر انور نے کہا۔ "میں کسی نہ کسی طرح کل کی فلائٹ کی جگہ حاصل کر لوں گا۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "انور! میں تو تمہارے ساتھ پنکھ لگا کر اُڑنے کو تیار ہوں۔ مگر

میاں صاحب ایک ہفتہ بعد نہ آسکیں۔ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ہمارے بعد ضرور لاہور پہنچ جائیں گے۔ وہ تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"یہ میں جانتی ہوں مگر اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں تنہا چھوڑ کر جانا برا لگتا ہے۔"

"صرف ایک ہفتہ کی بات ہے دیکھو مومی! تمہارے کہنے پر میں ہوٹل چھوڑ کر کوٹھی میں آگیا ہوں۔ اب تمہاری خاطر ڈھاکا چھوڑ کر لاہور جانے کے لیے تیار ہوں اور تمہارے ساتھ میاں صاحب کو بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ لہٰذا تمہیں بھی میری خواہش کے مطابق یہاں سے چلنا ہو گا۔ تم یہاں رکنے کا کوئی بھی بہانہ کرو گی تو میں تنہا چلا جاؤں گا۔ تاکہ کبھی تمہاری صورت نظر نہ آئے کیا تم چاہو گی کہ میں ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤں؟ بولو مومی! میرے ساتھ چلو گی نا؟"

وہ امداد میاں کے لیے پریشان تھی۔ اس نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے انور کو دیکھا۔ پھر سر کو جھکا لیا۔

رات جا رہی تھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ مومی اور امداد میاں کی آنکھوں میں اتنے آنسو تھے کہ ان آنکھوں میں نیند نہیں سما سکتی تھی۔ انور دن کے گیارہ بجے وہاں سے گیا تھا پھر شام کو پانچ بجے واپس آکر اپنے طور پر یہ خوشخبری سنائی تھی کہ کل کی فلائٹ پر دو سیٹیں مل گئی ہیں گویا وہ رات مومی اور امداد میاں کے لیے آخری رات تھی۔

وہ دونوں رہ رہ کر آہیں بھر رہے تھے' کبھی رو رہے تھے' کبھی ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ مومی لاہور جانے سے بار بار انکار کر رہی تھی۔ امداد میاں اسے بڑے پیار سے تھپک تھپک کر لاہور جانے کے فائدے گنوا رہے تھے۔ بڑھاپے میں اس کی جوانی کی قسمیں کھا کر یقین دلا رہے تھے کہ وہ ہفتے دس دن میں اس کے پیچھے چلے آئیں گے پھر وہ تینوں مل کر پاکستان کے اس حصے میں ایک نئی زندگی گزاریں گے۔

امداد میاں کے اصرار پر مومی روتے روتے سامان باندھ رہی تھی۔ جانا نہیں چاہتی تھی مگر جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ دوسری طرف انور کی بھی تو کشش تھی امداد میاں کے پاس اس وقت ڈیڑھ لاکھ روپے نقد تھے۔ مومی کے پاس تقریباً دو لاکھ روپے کے



زیورات تھے۔ امداد میاں نے تمام نقدی اور زیورات اس کے سامان میں بندھوا دیئے۔ بار بار نصیحتیں کرتے رہے کہ انور پر زیادہ بھروسہ نہ کرے۔ تھوڑی بہت نقدی اور زیورات برے وقت کے لیے چھپا کر رکھ لے۔ ویسے انور اچھا آدمی ہے مگر ذہین عورت اپنے اچھے مرد سے بھی کچھ چھپا کر رکھتی ہے۔

مومی نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "کیا ہم کبھی اپنے دیس واپس نہیں آئیں گے؟"

"اللہ نے چاہا تو ایک دن یہاں آئیں گے۔ اپنے لوگوں کو کہہ دیں گے کہ تم نے کسی کا بچہ گود لیا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "جس طرح بچہ ماں کی کشش ہوتا ہے۔ اسی طرح میں اس زمین سے لگی ہوئی ہوں۔ یہاں سے جاتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اندر سے جان نکل رہی ہے۔ پتا نہیں لوگ کیسے اپنا وطن چھوڑ دیتے ہیں۔"

"رفتہ رفتہ چھوڑنے کی عادت ہو جاتی ہے جس زمین پر محبت ملتی ہے وہیں اپنا وطن بن جاتا ہے۔"

وہ رات دونوں نے جاگ کر گزار دی صبح آٹھ بجے انور اپنا مختصر سامان لے کر آگیا۔ وہاں سے امداد میاں کی کار پر ائرپورٹ جانا تھا۔ مومی بے اختیار امداد میاں سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی عجیب منظر تھا۔ وہ ایک محبوب کے ساتھ جانے کے لیے دوسرے محبوب کی جدائی کا صدمہ اٹھا رہی تھی۔ ائرپورٹ پر بھی یہی تماشا رہا۔ امداد میاں اور انور اسے تھپک تھپک کر سمجھاتے رہے۔ وہاں بہاریوں کے سبھی خاندان رو رہے تھے۔ اس لیے کوئی نہ سمجھ سکا کہ مومی کیوں رو رہی ہے۔

آخر وہ تقسیم ہو گئی۔ اپنا دل امداد میاں کے پاس چھوڑ دیا۔ جان انور میاں کے ساتھ لے گئی۔ اپنی گاڑی کی طرف واپس جاتے وقت امداد میاں کو زندگی بھا رہی تھی مومی کے چھوڑ جانے سے دل کیسے دُکھ رہا تھا۔ یہ دکھ سینے کے اندر ہی سلگ رہا تھا۔

پہلے کچھ دن بڑے کرب سے گزرے مومی کے بغیر گھر میں رکھی ہوئی مومی کی ایک ایک چیز' ایک ایک یاد منہ چڑاتی تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ وعدے کے مطابق مومی کے پیچھے نہیں گیا۔ دوسرے ہفتے جنگ چھڑ گئی۔ لہو دے کر پاکستان بنانے والے بنگالیوں نے پھر

ایک بار لہو دے کر اس زمین کو بنگلہ دیش بنا دیا تاریخی عوامل کے طمانچوں سے انسان کے مزاج، اصول اور نظریات سب کچھ بدل جاتے ہیں صرف زمین کا رشتہ نہیں بدلتا۔ اس رشتے سے وہ بنگالی تھے بنگالی رہے۔

امداد میاں جانتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا اور پاکستان کے دوسرے بازو سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ راہیں الگ ہو جائیں گی اجنبیت کی اتنی اونچی دیوار کھڑی ہو جائے گی کہ پھر وہ مومی کے پاس نہیں جا سکے گا مومی اس کے پاس آنے کے لیے تڑپے گی۔ پھر اسے قرار آنے لگے گا، انور کے جوان بازوؤں میں چھپ کر وہ بوڑھے ماضی کو بھولنے لگے گی۔

وہ بوڑھا دن رات روتا رہتا تھا کبھی مرجانے کے لیے سوچتا تھا۔ پھر اس آس میں زندہ رہتا کہ وہ ایک دن واپس آئے گی۔ اس نے ایک وکیل کے پاس جا کر وصیت نامہ لکھوایا کہ اس کی بیوی مومنہ بیگم عرف مومی اپنے عزیز سے ملنے مغربی پاکستان گئی تھی۔ وہ اپنے عزیز کے ایک بچے کو گود لے کر وطن واپس آنے والی تھی کہ واپسی کے راستے بند ہو گئے اگر کبھی پاکستان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کے درمیان آمدورفت کا راستہ کھلے یا مومی کسی دوسرے ذریعہ سے بنگلہ دیش پہنچے اور یہاں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لے تو امداد میاں کی تمام دولت جائداد کی وہ بلا شراکت غیر حقدار ہو گی۔ امداد میاں کی موت کے بعد وہ دوسری شادی کرے گی تب بھی یہ وصیت اس کے حق میں ہو گی۔

دو سال کے بعد مومی کا ایک خط برما کے راستے پہنچا۔ امداد میاں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر پڑھا۔ اس خط میں لفظوں کے آنسو تھے۔ اس نے لکھا تھا۔ "میں یہاں آ کر پچھتا رہی ہوں۔ آپ کو چھوڑنے کی سزا پا رہی ہوں۔ انور مجھے بہت چاہتے تھے سنا تھا کہ ایک شخص کی چاہت سے عورت کی دنیا بدل جاتی ہے مگر تجربہ سے پتا چلا کہ ایک شخص دن رات توجہ نہیں دے سکتا اس کی دوسری مصروفیات بھی ہوتی ہیں اور میں یہاں ایک ایسی ننھی سی بچی ہوں جسے ہر لمحہ توجہ چاہیے۔ کیونکہ یہاں کی زبان نہیں جانتی یہاں کا لباس اور طور طریقے ہم سے بالکل الگ ہیں۔ مجھے ایک نئی بچی کی طرح عمر کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب کو سیکھنا پڑے گا اور یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ میں حقیقتاً بچی نہیں ہوں۔ ہوا کے تھپیڑوں سے نئی کونپل کھل جاتی ہے مگر میں تناور



درخت ہوں۔ ٹوٹ سکتی ہوں۔ جھک نہیں سکتی۔ یہاں آ کر میں قید ہو گئی ہوں فرار کا راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ راستہ نظر آیا تو میں انور اور بچے کو لے کر واپس آ جاؤں گی۔"

مومی نے اور بہت کچھ لکھا تھا مگر امداد میاں کے دل کو یہی بات لگی کہ مومی، انور کے پاس رہ کر بھی خوش نہیں ہے اور کبھی وہ واپس آ سکتی ہے۔

وہ خط پڑھ کر بہت خوش ہوا، پھر رفتہ رفتہ خوشی اس فکر میں بدلنے لگی کہ انور بھی اس کے ساتھ ہو گا پھر وہی بے شرمی کی زندگی ہو گی پھول کے ساتھ ایسا کانٹا لگا ہوا تھا کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کاش وہ مر جاتا۔ دوسری طرف شاید انور بھی امداد میاں کے لیے یہی سوچتا ہو گا۔

امداد میاں نے دل میں ٹھان لی کہ وہ مومی کے لیے قربانی دے گا۔ وہ جوان ہے، اسے جوان مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کا موقع دے گا۔ اس لیے اس نے مومی کو بہلا پھسلا کر انور کے ساتھ آہنی دیوار کے اس پار بھیج دیا تھا جہاں سے وہ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ انسان عجیب چیز ہے جس کے لیے مرنا چاہتا ہے اسی کی آس میں جیتا رہتا ہے اتنی قربانی دینے کے باوجود امداد میاں کے دل میں ایک آس تھی کہ مومی کسی دن واپس آئے گی۔ اسی لیے اس نے وصیت لکھوا دی تھی۔ مومی کا خط پڑھنے کے بعد اسے دوبارہ پا لینے کا یقین ہو گیا تھا اور اب اتنا کچھ ہونے کے بعد دل سے دعا نکل رہی تھی کہ انور مر جائے۔

بے چارہ خود مرنے کی عمر کو پہنچ گیا تھا مگر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے موت آئے گی۔ آئے گی بھی تو اس سے پہلے مومی آئے گی۔ سب یہی سوچتے ہیں کہ مرنے سے پہلے آرزو پوری ہو جائے گی اور سوچتے سوچتے اپنی زندگی پر بڑھاپا لے آتے ہیں۔ سوچتے سوچتے چھ برس گزر گئے۔ وہ کچھ اور بوڑھا ہو گیا۔ آنکھوں سے کم نظر آنے لگا۔ اب کوئی چیز اٹھاتا تو اس کے ہاتھ کانپتے۔ مومی کے متعلق سوچتا تو گردن ہلنے لگتی۔ مومی کے انتظار نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ایک شام ایک ٹیکسی کوٹھی کے سامنے آ کر رکی۔ امداد میاں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا تو دل کی دھڑکنیں یکبارگی بڑھ گئیں۔ مومی ٹیکسی سے سامان اتروا رہی

تھی۔ اس کے ساتھ پانچ یا ساڑھے پانچ برس کا ایک نہایت ہی خوبصورت سا لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ انور نظر نہیں آرہا تھا۔ کیا وہ مر گیا تھا؟ یا مومی اسے چھوڑ کر آگئی تھی؟

مارے خوشی کے امداد میاں کی ٹانگیں کانپنے لگیں سینے کے اندر دھڑکنوں کی دھمک برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کھڑکی کی سلاخ پکڑ کر اور دوسرے ہاتھ سے دل کو تھام کر آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا۔ اس میں کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ پرواز کرتے ہوئے مومی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر مسرتیں اسے اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔

وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوششیں کرنے لگا اس وقت اس کی شدید خواہش تھی کہ جوانمردوں کی طرح یکبارگی اچھل کر دوڑتا ہوا مومی کو پکارتا ہوا جائے اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر سارے گھر میں ناچتا پھرے مگر افسوس' بڑھاپے کے سلو موشن میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

تھوڑا سا وقت گزرا تو مومی خود اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ سامنا ہوتے ہی اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ امداد میاں کی مونچھیں' سر کے بال چاندی ہو گئے تھے۔ وہ تو پہلے بھی سفید تھے۔ مگر ان کی سفیدی کسی نے دیکھی نہیں تھی۔ مومی کے شایانِ شان نظر آنے کے لیے خضاب لگایا جاتا تھا بہرحال اتنے عرصہ بعد مومی کو وہ بہت بدلا ہوا نظر آیا چہرے کی جھریاں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ اسے پہچاننے کے لیے مومی کو ذرا رکنا پڑا

پھر پہچانتے ہی وہ دوڑتے ہوئے آئی۔ اس کے پاس بیٹھی۔ منہ سے کچھ نہ نکلا ادھر یہ چپ تھی ادھر وہ مومی کو محسوس کرنے میں گم تھا۔ ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے کہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود میں ٹھہر گئے تھے۔

پھر وہ بولا۔ "میرا دل کہتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔"

"اور انور؟"

مومی کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی۔ "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

امداد میاں نے ایسی سانس چھوڑی جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ افسوس کا اظہار ہے یا اطمینان کا سانس؟ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ امداد میاں نے محسوس کیا کہ



وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر اپنے آنسو چھپا رہی ہے۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ "صبر کرو۔ موت ایک ایسی سرحد ہے جسے پار کرنے کے بعد کوئی مسافر واپس نہیں آتا۔ صبر کرو............"

مومی الگ ہو کر ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر جلدی سے مسکرا کر بولی۔ "میں نے آپ کو پھر سے پا لیا ہے۔ مجھے رونا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "مومی! اگر وہ زندہ ہوتا تو تم نہ آتیں؟"

"کیوں نہ آتی؟ وہاں انور کے سوا میرا کیا تھا؟ کچھ نہیں۔ وہاں جا کر مجھے غلطی کا احساس ہوا میں اپنے آباؤ اجداد کے ناتے سیکڑوں ہزاروں سال سے بنگالی ہوں' مجھے احساس ہوا کہ میں نے جس بیٹے کو جنم دیا ہے اسے وہاں رہ کر غیر بنگالی بنا رہی ہوں میں نے انور سے کہا۔ میرا بیٹا یہاں جس صوبے میں رہے گا اسی صوبے کی زبان سیکھے گا۔ پھر میری زبان کا کیا ہو گا؟ انور نے کہا ہم کراچی جائیں گے۔ وہاں جس صوبے کے لوگ بھی آتے ہیں' اردو بولتے ہیں۔"

مومی بولتے بولتے رک گئی۔ دوسرے کمرے میں سے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی تھی' مومی نے اپنے بیٹے کو پکارا "ببلو! اتمی کو تھائے؟ ایکھنے آشو۔"

امداد میاں نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا ہمارا بیٹا بنگالی بولتا ہے؟"

"ہاں انور اسے اردو سکھاتے تھے اور میں بنگالی۔ میں ان سے ضد کرتی تھی کہ اردو بولنا چھوڑ دو۔ واپس چلو۔ مگر وہ مجھے اور ببلو کو لے کر کراچی چلے گئے۔"

اتنا کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امداد میاں نے حیرانی سے پوچھا۔ "اب رونے کی کیا بات ہے؟"

وہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بولی۔ "کیا یہ رونے کی بات نہیں ہے کہ وہ اردو بولتے ہوئے مارے گئے ہم کراچی پہنچے تو وہاں دو زبانوں کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا ہم وہاں اجنبی تھے۔ بھٹکتے ہوئے ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں اردو کے مخالف تھے۔ وہ مخالفت کا شکار ہو گئے۔ میں اور ببلو صرف بنگالی بولتے تھے اسی لیے بچ گئے۔ اگر ہم انور کی زبان بولتے تو

ہمارا کیا ہوتا؟ میرا ببلو کہاں جاتا؟"

اتنے میں ببلو آگیا۔ مومی اس سے لپٹ کر اسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ کہنے لگی۔ "بیٹے! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے ابا بنگلہ دیش میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ یہی تمہارے ابا ہیں۔"

"نہیں۔" وہ ماں کی گود سے ایک دم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "یہ میرے ابا نہیں ہیں۔ یہ تو بہت بڈھے ہیں۔"

امداد میاں کے دماغ کو شدید جھٹکا سا لگا۔ وہ ببلو کو دیکھ رہا تھا۔ ببلو اسے گھور رہا تھا۔ تب امداد میاں کو معلوم ہوا کہ انور ابھی زندہ ہے۔ ابھی جوانی اور بڑھاپے کا بے حیا سمجھوتہ بھی زندہ ہے۔ آدمی لاکھ پردہ ڈالے تب بھی اس کی غلطی پردے کے پیچھے ہی پیچھے آئندہ نسل تک پہنچ جاتی ہے۔

ببلو کو کون مٹا سکتا تھا؟

☆======ختم شد======☆